الحياة والموت

في فلسفة إقبال رح

بالعربية والأردية

اقبال کا فلسفۂ حیات و موت

ترجمه الى العربية
نثراً ونظماً

محمد حسن الأعظمي
(من علماء الأزهر)
سکریٹری جنرل عالمی تنظیم
اتحاد العالم الاسلامی

و

الصاوی علی شعلان
(الماجستير من جامعة القاهرة)
نائب صدر شعبۂ تحریر و تقریر
اتحاد العالم الاسلامی

الناشر
الأزهر پرنٹرز اینڈ پبلشرز کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ
۱۴۷ گارڈن مارکیٹ کراچی۔ (فون ۷۷۶۷۶)۔

سول ایجنٹ: مکتبۂ الفیروز - ۱۰۶ اگرهالی بلڈنگ صدر کراچی
نمبر ۷۸ پانچویں منزل نور چیمبرز بندر روڈ کراچی

حقوق الطبع محفوظة المترجمین

IQBAL ACADEMY LIBRARY
10371
LAHORE

تعداد طباعت	ایک ہزار
کتابت	محمد نذیر (نیکا کارنر ۳۴۳ گڈھیالی بلڈنگ صدر کراچی)
دوسرا ایڈیشن	اپریل ۱۹۶۹ء
پریس	سپر آرٹ کراچی

★

The Public Library,
Bagh Langa Khan Multan,
Accession No.. 25136.....
Call No...... Book No.........

محتویات

۱۔	انتساب		۵
۲۔	حرف آغاز	از محمد حسن الاعظمی	۷
۳۔	تعارف	از سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن	۱۱
۴۔	مقدمہ	از علامہ محمد رزق المصری	۲۰
۵۔	تقدیر الکتاب	از ڈاکٹر عبدالوہاب عزام	۲۶
۶۔	اقبال کے متعلق	از ہندو لیڈر روستیہ جیب	۲۸
۷۔	الکتاب الاوّل: فی فلسفۃ الحیاۃ و الموت		۳۲
۸۔	کتاب اوّل: اقبال کا فلسفہ حیات و موت		۳۱
۹۔	الکتاب الثانی: النشید الاسلامی		۱۲۴
۱۰	کتاب ثانی: ترانہ ملی		۱۲۵
۱۱	حدیث الروح	از سیدہ اُم کلثوم	۱۲۶

شکوی بجواب شکوی	۱۴۷
مقدمہ	۱۴۸
شکوی (عربی۔ اردو)	۱۵۸
جواب شکوی (")	۱۶۷
فاطمۃ الزہرا	۱۹۴
کتاب الثانی: اقبال کا خاندان	۱۹۹
آفتاب اقبال	۲۰۳
افتتاحی تقریر	۲۰۶
رشید بیگم آفتاب	۲۲۱
اقبال پر بہتان اور اس کی حقیقت از ملا واحدی	۲۲۳
شاعر اسلام، محمد اقبال از مدیر مجلہ ازھر	۲۲۵
علامہ سے متعلق چند حقائق	۲۳۱

الاهداء

الى المحامی آفتاب اقبال (النجل
الاکبر للعلامة اقبال) رئیس
المنظمة العالمیة "اتحاد العالم
الاسلامی"

انتساب

بنام جناب آفتاب اقبال صاحب
(فرزند اکبر علامہ اقبال) صدر عالمی تنظیم
اتحاد عالم اسلامی

حرف آغاز

دوسری جنگ عظیم کے دوران دنیائے اسلام کے سب سے بڑے ثقافتی شہر قاہرہ میں عربی کے مشہور رسالہ الثقافہ والرسالہ اور "مجلۃ الازہر" وغیرہ کے لئے مفکر پاکستان علامہ اقبال کے بین الاسلامی تصورات سے لبریز اشعار کو میں نے نثر میں ترجمہ کیا جسے جامعۂ ازہر کے ممتاز شاعر و عالم استاد صاوی علی شعلان نے منظوم کیا جنہیں مقالات کی شکل میں شائع کر کے علامہ سے عربی و اسلامی دنیا کے علماء و ادباء کو متعارف کرایا گیا تھا۔ اس کے قبل ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء سے اردو کلام کا سب سے پہلے ہم نے ہی منثور و منظوم ترجمہ پیش کیا تھا جو عالمی تنظیم "جماعت الاخوۃ الاسلامیہ" کے ثقافتی اجلاسوں میں بڑی دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ اور نمائندگان عالم کے ذریعے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گئے ہیں۔ اسی تنظیم کا مرکز لمبنوۂ

قائدِ اعظم نے ۱۹۴۸ء میں کراچی منتقل کیا گیا اور ۱۹۴۹ء کے عالمی اجلاس کے موقع پر مصلحتاً نام بدل کر "موتمر العالم الاسلامی" اختیار کر لیا گیا تھا پھر ۱۹۶۲ء میں "اتحاد العالم الاسلامی" کے نام سے رجسٹرڈ کروا لیا گیا ہے۔ اس کے سابق صدور میں مرحوم مفسر اعظم شیخ طنطاوی جوہری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سفیر مصر متعینہ پاکستان، علامہ نواب رشید مکی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی شامل ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے اکتیسویں ۳۱ سال کی صدارتی ذمہ داری جناب آفتاب اقبال صاحب کے سپرد کی گئی ہے، اور اسی مناسبت سے اس کتاب کا انتساب موصوف کے نام ہے۔

اختتام جنگ کے ساتھ ہی "اقبال کا فلسفۂ حیات و موت" نامی کتاب بذریعہ بزم اقبال حیدر آباد دکن عربی اردو میں شائع کی گئی، جس کے نسخے پاکستان میں نایاب ہیں۔ اس کے اس دوسرے ایڈیشن میں شکوہ و جواب شکوہ، اور ان دونوں کے ۲۸ منتخب اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے، جنہیں مطربہ شرق سیدہ ام کلثوم نے ۴ مئی ۱۹۶۷ء کے ایک جشن موسیقی میں گا کر اور دس ہزار رکارڈ بنوا کر پاکستان کی بے مثال خدمت کی ہے ان رکارڈوں کو عرب و اسلامی ممالک کے ریڈیو و ٹیلی ویژن سے

باقاعدہ سُنایا جارہا ہے۔

اسی صلے میں حکومت پاکستان نے سیّدہ اُم کلثوم کو تمغۂ امتیاز سے نوازا، اور ناظم اُستاد صاوی شعلان کو ایک سال کی دعوت پر پاکستان بُلایا ہے تاکہ مزید ترجمہ کر سکیں۔ ۱۹۵۰ء میں ہمارے تراجم کا مجموعہ کتاب "فلسفہ اقبال الاسلامیہ" کے نام سے قاہرہ کے مشہور ناشر عیسیٰ البابی الحلبی نے شائع کیا ہے، جس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا مسلسل تقاضا کیا جارہا ہے یہ دونوں کتب عربی میں پہلی بار شائع ہوئیں جن کی ہر دلعزیزی کے سبب اب عربی میں اقبال کے اور بھی تراجم شائع ہو رہے ہیں۔

وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

محمد حسن الأعظمی
بانی سکریٹری جنرل
الاتحاد العالم الاسلامی

تعارف

از

سر شیخ عبدالقادر بالقابہ

چیف جسٹس بہاولپور، پنجاب

و

سابق مدیر رسالہ "مخزن" (۱۹۴۱ء)

تعارف

پروفیسر محمد حسن الاعظمی صاحب (عالم ازہر یونیورسٹی مصر و سابق پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی) ہمارے ملک کے اُن چیدہ اصحاب میں سے ہیں جن کی شہرت وطن کی حدود سے بڑھ کر دور دراز بیرونی ملکوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ اعظم گڈھ (یو۔پی) کے رہنے والے ہیں، ہندوستان میں علوم مشرقی کی تحصیل کے بعد شوقِ علم انہیں کشاں کشاں مصر کو لے گیا، وہاں وہ جامعۂ ازہر میں مدارج علمی طے کرتے ہوئے قاہرہ کی مشہور مصری یونیورسٹی کے پروفیسر ہو گئے، اور انہوں نے زبان عربی میں یہاں تک دسترس حاصل کی۔ کہ اُن کی تحریریں وہاں کے اخباروں اور ادبی رسالوں میں مقبول ہونے لگیں۔ اس کے بعد انہوں نے بہت سی کتابیں عربی میں تصنیف کیں، جو نگاہِ پسندیدگی سے دیکھی گئیں۔ اُن کتابوں میں "شرح دیوان الامیر تمیم الفاطمی" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب کو حکومت مصر نے ازہر و قاہرہ کی ہزار سالہ جوبلی کے جشن کے لئے

شائع کرنے کا تقاضہ کیا ہے

بعض کتابوں کے ذریعے آپ نے اہلِ مصر کو ہندوستان کے تاریخی اور دیگر حالات سے آگاہ کیا۔ پھر مصر کے حالات پر آپ نے اردو میں کتابیں لکھیں تاکہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے دلچسپی ہو اور یہ دلچسپی ادبی اور تجارتی تعلقات کی ترقی کا زینہ بنے۔

لغتِ عربی کے متعلق بھی آپ چند کتابیں لکھ رہے ہیں جن میں المعجم الأعظم یا عربی اردو لغات پانچ جلدوں میں ہوگی۔ اور دوسری اردو عربی لغات، اس کی بھی کئی جلدیں ہوں گی۔

ایک کتاب فلسفۂ اقبال پر عربی میں لکھی ہے جس کے ذریعے سے انہوں نے مصر کے ذی علم طبقہ کو اقبال سے روشناس کیا۔

ہندوستانی مدارس میں عربی کو ہر دلعزیز کرنے کے لئے سلسلہ القراءة الأعظمية، المكالمة الأعظمية اور مدارس العربية کے نام سے متعدد کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ یہ کتابیں كلية اللغة العربية کے نصاب میں داخل کرلی گئی ہیں۔

اِن علمی خدمات کے علاوہ ایک بڑا کام جو اعظمی صاحب نے

انجام دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے علماء اور ادیبوں کے تعاون سے ایک عالمگیر جماعت مصر میں قائم کی ہے جس کا نام الاُخوّۃ الاسلامیّۃ ہے۔ اس جماعت کے سابق صدر مرحوم علامہ طنطاوی جوہری مفسّر قرآن اور موجودہ رئیس جناب ڈاکٹر عبدالوہاب عزام ایک مصری فاضل ہیں۔ جو مصری یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے صدر شعبہ ہیں۔ اور اس عالمگیر جماعت کے جنرل سکریٹری اعظمی صاحب ہیں۔ اس جماعت کے اکثر اراکین ہمارے ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے مدّاح ہیں۔

اس جماعت کے صدر دفتر قبّۃ الغوری قاہرہ میں ہر ہفتہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے فلسفہ وخیالات کی تشریح وتوضیح پر مصری ادباء وعلماء لکچر دیتے ہیں۔ ان مجالس میں قابلِ رشک دلچسپی لینے والے ایک مصری ادیب الشیخ الصاوی شعلان ہیں، وہ عربی نظم خوب لکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے بہت سے اشعار کو عربی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اقبال ہندی نژاد ہوتے ہوئے اور فارسی و اردو میں

ؔ آپ پاکستان میں مصر کے مختار سفیر رہ چکے ہیں۔

شعر کہنے کے باوجود عربی زبان اور عربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا جیسا اس کے مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ع

عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری

وہ اگر آج زندہ ہوتا تو یہ دیکھ کر کہ اس کا کلام عربی زبان کی وساطت سے عربوں میں پھیل رہا ہے بہت خوش ہوتا۔

اعظمی صاحب اپنی یونیورسٹی سے رخصت لیکر لیبیا کی جنگ سے کچھ عرصہ پہلے اس غرض سے ہندوستان میں آئے تھے کہ اپنی سوسایٹی کی شاخیں ہندوستان میں قائم کریں۔ اور اہل ہند سے دوستی پیدا کرنے کا جو شوق انہوں نے مصریوں میں پیدا کیا ہے، اس کا جواب ادھر سے بھی شروع ہو تاکہ یہ رابطہ دونوں ملکوں کو نفع بخشے۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ اُن کے آنے کے بعد جلد ہی جنگ کی شدت زیادہ ہو گئی اور بحری راستے بڑی حد تک مسدود ہو گئے۔ اس طرح انہیں دیر تک یہاں ٹھہرنا پڑا۔ ممکن ہے کہ انہیں اپنے وہاں کے فرائض کی زیادہ کشش ہو، لیکن اُن کا یہاں رہنا اُن مقاصد کے لئے جو اعظمی صاحب کے پیش نظر ہیں مفید ثابت ہو رہا ہے۔

اُنہوں نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے، جو ہے تو چھوٹی سی، مگر نہایت قدر کے قابل ہے۔ اس میں تھوڑی سی جگہ میں اقبالؔ مرحوم کا "فلسفۂ حیات و موت" وضاحت سے اور بہت موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اس کتاب کی یہ عجیب صفت ہے کہ یہ اُردو میں بھی ہے اور عربی میں بھی۔ نظم میں بھی ہے اور نثر میں بھی۔ اس عربی حصۂ نظم ونثر کی داد تو اہل زبان دے سکیں گے، مگر اس کی سلاست کی بابت اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہم کم علموں کو بھی عربی حصے کا مطلب سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے۔

ایک اور چیز جو اس ترجمہ کو دیکھ کر نظر آئی وہ یہ ہے کہ کئی جگہ اُردو میں جو مطلب ہمارے اقبالؔ نے ایک شعر میں ادا کیا ہے، اُس کو پوری طرح ادا کرنے میں عربی کے ناظم کو دو شعر لکھنے پڑے ہیں۔ یہ تو میرا ہمیشہ سے عقیدہ تھا کہ اردو میں دقیق مطالب کو عمدگی سے ادا کرنے کی صلاحیت ہے، اور وہ قدیم اور زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی خوبیاں پیدا کر رہی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا۔ کہ بعض اوقات اختصار کے لحاظ سے اُردو اُن سے بازی لے جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ لکھنے والا ایسا باکمال ہو

جیسے اقبال تھا۔

شیخ الصاوی شعلان کے اشعار کے متعلق یہ اعتراف واجب ہے کہ وہ اردو اور فارسی اشعار کے مطالب کو صحیح طور پر ادا کرنے میں اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

کلام اقبال کے کئی حصے، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں لیکن دنیائے اسلام کے اہم ترین حصص عربی بولنے والی قوموں سے پُر ہیں۔ اس لیے اُن تک اقبال کے پیغام حیات کا پہنچنا بہت اُمید افزا ہے۔

اقبال کے ترانۂ ملی کا منظوم عربی ترجمہ بھی اس کتاب میں درج کیا گیا ہے، یہ ترجمہ نہایت دلکش ہے۔ ان کا ملکی ترانہ اور ملی ترانہ دونوں اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ ملکی ترانہ لکھنے کا خیال میں نے اُن کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور اُن سے یہ کہا تھا کہ جیسے انگریزوں کا نیشنل گیت ہر موقع پر گایا جاتا ہے اور فوجی باجے کے ساتھ بجایا جاتا ہے، ایسی کوئی نظم ہمارے ہندوستان کے لیے ہونی چاہیے، وہ سنتے ہی سوچنے لگ گئے اور اُن کی زبان سے یہ مصرعہ نکلا: ؎

ی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی
بیسویں سال کے پہلے
ر لیتے ہیں۔ آفتاب اقبال صاحب
نے والد کا کلام سنا رہے ہیں۔
پروفیسر محمد حسن الاعظمی
سکریٹری جنرل)
ترجمہ کر رہے ہیں۔
طرف شاعر ازہر
ح صادی شلان
نیر پاکستان و ...
ر اظہار مسرت کر رہے ہیں

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

میں نے کہا بہت خوب ہے اب اس نظم کو مکمل کر دیجئے۔ ایک دو دن بعد وہ نظم مکمل ہو گئی، اور اس قدر مقبول ہوئی کہ کوئی نیشنل مجمع ایسا نہ تھا جس میں وہ گائی نہ گئی ہو۔ اس کی قبولیت کو دیکھ کر بعض اور دوستوں کو یہ خیال آیا کہ اقبال سے کہیں کہ جیسا گیت ہندوستان کے لئے لکھا ہے، ویسا ہی دنیائے اسلام کے لئے لکھا جائے۔ اقبال کیلئے یہ تجویز اور بھی دلپذیر ثابت ہوئی، اور ترانۂ ملی نظم ہو گیا۔ جس کا مطلع ہے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

معلوم نہیں ان دو مصرعوں میں کتنی تاثیر ہے کہ یہ شعر اب بیرونی ملکوں میں جہاں کہیں مسلمان ہیں مقبول ہو گیا ہے۔

دیکھئے یہ شعر عربی لباس میں کیسے سجا ہے

اَلصِّینُ لَنَا وَالعَرَبُ لَنَا ، وَالھِندُ لَنَا وَالکُلُّ لَنَا
أضحی الاسلام لنا دیناً وجمیع الکونِ لنا وطنا

عربی کے استاد نے بحر بھی خوب چنی ہے جو فوجی باجے کے ساتھ
بہت بھلی معلوم ہوگی۔ اعظمی صاحب بتلاتے ہیں کہ مصر اور عراق کے بعض
مدارس میں لڑکے جھوم جھوم کر یہ ترانہ پڑھتے ہیں، اور یہ عالمگیر جماعت
"الاخوۃ الاسلامیہ" قاہرہ کا خاص ترانہ مقرر کیا گیا ہے، جو تقریباً تمام
دنیائے اسلام میں منتشر ہو چکا ہے۔

ان چار مصرعوں میں جو میں نے عربی ترجمے سے نقل کئے ہیں، میرے اس
قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ اردو کے دو مصرعوں کا مطلب چار مصرعوں
میں سمایا ہے، لیکن ازرہِ انصاف ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ چھوٹی بحر
کی وجہ سے دو مصرعوں سے کام نہیں نکلتا تھا اور ساتھ ہی اس آزاد ترجمہ
میں ایک دو خوبیاں اردو سے بڑھ کر پیدا کی گئی ہیں۔ مثلاً "والکلُّ لنا"
نے اس مصرعے کے مضمون کو بلند تر کر دیا ہے، اور "اضحی الاسلام لنا دینا"
میں بھی ایک شان ہے جو اردو میں اس قدر خوبصورتی سے نہیں ادا ہوئی
تھی۔ گو ہندوستان کے شاعر نے "مسلم ہیں ہم" کہتے ہوئے بہت کچھ
کہہ دیا تھا۔

یہ کتاب اپنی طرز کی ایک نرالی چیز ہے اور امید قوی ہے کہ یہ

برِّ صغیر اور مصر دونوں ملکوں میں مقبول ہو گی، بلکہ جہاں کہیں عربی بولی یا سمجھی جاتی ہے، وہاں اقبال کے پیام کا یہ حصہ اس کے ذریعے پھیل جائے گا، کہ مسلمان کا خاصہ ہے کہ موت سے نہ ڈرے اور موت کو زندگی کی ایک آئندہ منزل کا راستہ سمجھے، اور اس کا عمل یہ ہو کہ موت زلیست اور زیادہ پائیدار زلیست کا ذریعہ ہے۔ اقبال نے اپنی جوانی کے اردو کلام میں یہی بلند خیال ایک سہل ممتنع مصرعے میں یوں ادا کیا تھا: ع

"جسے مرنا نہیں آتا، اُسے جینا نہیں آتا"

عبدالقادر

مُقَدَّمَة

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله حمداً كثيراً مباركاً فيه كما يحب ربنا ويرضى والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد القائل فيه ربه و لسوف يعطيك ربك فترضى، وعلى آله وصحبه وتابعيه الى يوم الدين۔

وبعد فقد ألقى حضرة العلامة الدكتور رضى الدين الصديقي الاستاذ بالجامعة العثمانيه بحيدرآباد دكن محاضرة باللغة الأردية عن فلسفة الحياة والموت فى نظر المغفور المرحوم الدكتور محمد اقبال الشاعر الاشهر و

ما وصلت هذه المحاضرة إلى حضرة الاستاذ الشيخ
محمد حسن الاعظمى الذى كان اذ ذاك مدرسا بالجامعة
المصرية بالقاهرة حتى قام بترجمتها إلى اللغة العربية
باسلوب رائع فاعجب بها الازهريون والمصريون المثقفون
ونشرت فى كبريات الجرائد اليومية والمجلات الاسبوعية
والاستاذ الشيخ محمد حسن الاعظمى شديد الذكاء
قوى الارادة جرئ قوى الايمان شديد الثقة بنفسه كاتب
خطيب من أكبر دعاة الجامعة الأسلامية الحقة ولما ذهب
إلى مصر وانخرط فى سلك الطلبة بالجامع الازهر الشريف ورأى
بفراسته أن تربة مصر هى التربة التى يرجوها لتحقيق دعوة
الوحدة الاسلامية أخذ يبث دعوته بين الطلبة والعلماء
فأجابوه وتعرف بالعظماء والوزراء فأحبوه وأجلوه فلما استوثق
من النجاح دعا (وهو ذالك الطالب الهندى) إلى تاليف
جمعية باسم الاخوة الاسلامية فتألفت برياسة الاستاذ
الجليل الدكتور عبد الوهاب بك عزام الاستاذ بالجامعة

المصرية ورئيس القسم الشرقي فيها وسرعان ما انضم اليها
فطاحل العلماء والوزراء كالمرحوم الاستاذ الشيخ طنطاوي
جوهري وفضيلة الشيخ صاحب المعالي مصطفى باشا
عبد الرزاق وكان هذا وزيرا الأوقاف فمنح الجمعية مكانا له
عظمته في وسط القاهرة فعظمت الجمعية وانتخب
أعضاؤها الاستاذ الاعظمي سكرتيرا عاما فاذا ذهبت الى
مقر الجمعية ترى جمعية الأقوام الاسلامية التي تضم
المصري والهندي والصيني والجاوي والتركي وغيرهم من
سائر الأقطار الاسلامية وكلهم كأسرة واحدة. الامر
الذي كان يسعى الى تحقيقه السيد جمال الدين الافغاني
ولم يتحقق الاعلى يد هذا الازهري الهندي الشيخ الاعظمي
ثم ماذا؟ طمح الشيخ الاعظمي الى شئ له قيمته فسعى
سعيا حثيثا بمساعدة من عرفهم من العلماء والأدباء
حتى جعل اللغة الاردية من اللغات التي تدرس
بالجامعة المصرية التي عينته أستاذا لهذه اللغة و

ادابها۔ ولهذ ازاد الصاله باساتذة الجامعة مثل الاستاذ
الدكتور طه حسين بك والاستاذ عبد الحميد عبادى
والاستاذ احمد امين والاستاذ الدكتور حسن ابراهيم
وغيرهم كثير من الذين عرفوا نبوغه فاحبوه واجلوه
وقد اخذ عنه اللغه الاردية الاستاذ الدكتور عبد
الوهاب عزام والاستاذ الصاوى شعلان الذى حول
الاشعار الادارية فى الحياة والموت الى اللغة العربية۔
نال الاستاذ الاعظمى شهادة العالمية من الجامعة
الازهرية بتفوق غبطه اهل اللسان العربى عليه ولة
مولفات شتى بعضها موضوع و بعضها مترجم منها ما تم
طبعه ومنها ما هو تحت الطبع كما ان بعضها بالعربية
والاردية وبعضها بالعربية مثل شرح ديوان الامير
تميم الفاطمى وبحث فى الشيعة ومحاضرات عن
مصر والقراءة الاعظمية والمكالمة الاعظمية وجامع
القواعد و مدرس العربية ومبادئ اللغة العربية والرسائل

الاعظمية والمعجم الاعظم وفتى الهند وغيرها.
ولايتكلمون الا باللغة العربية الفصيحة التى تطاوعه
ألفاظها وتأتى اليه طائعة معانيها. يؤتى الحكمة من
يشاء ومن يوت الحكمة فقد أوتى خيرا كثيرا. هذا و
يحسن بنا قبل أن نختم هذه العجالة أن ننوه بما تضمنته
فلسفة الحياة والموت لاسيما اثناء هذه الحرب الطاحنة من أن
ذلك سيفيد المسلمين عموما وشبابهم خصوصا و
قد شعر بهذا طلاب الازهر من الاقطار الاسلامية فترجموا
الى لغاتهم المختلفة ونشروها فى جميع أنحاء العالم
الاسلامى. وهذا ولاشك سيكون سببا فى توثيق
عرى الوئام بين المسلمين جميعا. ولعل هذا الكتاب هو الاول
فى بابه من انه جاء للمسلمين كافة وخلد ذكر منشئه وهو
الدكتور المرحوم محمد اقبال ونرجو أن ينسج كثير من
اخواننا المسلمين خصوصا المصريين على منواله حتى يتم
الاخاء بين الجميع وليصبح المسلمون مع بعد الشقة كأسرة

واحدة اذا تألم عضو منها تألم لاجله بقية الاعضاء نسأل الله أن يجزى المسبب فى بث هذا المبدأ السامى بيننا وهو فضيلة الاستاذ الشيخ محمد حسن الأعظمى سدد الله خطاه وأبلغه ما يتمناه انه قريب مجيب ؛

محمد رزق المصرى

من علماء الازهر

(نزيل لاهور)

تصدير الكتاب

بقلم الدكتور عبد الوهاب عزام رئيس جماعة الأخوة الإسلامية مصر

محاضرة ألقاها في حفلة لتأبين إقبال في الهند باللغة الأردية الدكتور رضي الدين الصديقي (رئيس قسم العلوم الطبيعة بالجامعة العثمانية بحيدر آباد دكن[1]) وترجمها إلى العربية الأستاذ محمد حسن الأعظمي الهندي، ونظم أبياتها الشيخ الصاوي شعلان.

ويرى فيها القارئ أمثلة بينة عن آراء "إقبال" في الحياة والموت، والجهاد والاستكانة، وصوراً من فلسفته التي جعل محورها "الذاتية" وحشد لتوضيحها كثيراً من بدائع الفكر والشعر، وعبر التاريخ والحياة، ولعلها فاتحة لامتاع قراء العربية بقطع رائعة من فلسفة،

[1] هو الآن مدير جامعة اسلام آباد عاصمة باكستان، خودي

إقبال وشعره؛ ولاريب أن القوة والأمل فى هذا الشعر يملأنهما أن أحوالنا التى تقتضى كل إنسان ما فى فطرته من إيمان وعزم وجهاد وصبر.

والذى قرأ شعر "إقبال" بالأردية والفارسية وعانى ترجمة الشعر نظماً يعجب كل الإعجاب بمقدرة المترجمين، و يشهد أنهما أصابا بالتوفيق فى هذا العمل الجليل.

وستنشر جماعة الأخوة الإسلامية بمصر (المؤلفة من جميع الأقطار الإسلامية) عما قليل كتاباً يتضمن كثيراً من فلسفة إقبال وشعره. يشترك فى تأليفه جماعة من الأدباء المعجبين بهذا الفيلسوف الشاعر الإسلامى الخالد.

عبد الوهاب عزام

(الأستاذ بالجامعة المصرية القاهرة)

پرنسپل كلية اللغة العربية (ازهر)

رئيس مركز جماعة الأخوة الإسلامية لقية الغورى القاهرة

اقبال کے متعلق

"اقبال نے اگرچہ شمع مسلمانوں کے دروازہ پر رکھ دی ہے
لیکن دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

ایک ہندو لیڈر

"اقبال کو نہ گورنمنٹ نے سمجھا، نہ قوم نے، کیونکہ اگر
گورنمنٹ سمجھتی تو بغاوت کے الزام میں اُسے جزیرۂ
انڈیمان بھیج دیتی، اور اگر قوم سمجھتی تو بغاوت کردیتی۔"

سید حبیب
مدیر سیاست

الكتابُ الاوّل

فی

فلسفة الحياة والموتْ

یعنے

کتاب اوّل

اقبال کا فلسفۂ حیات وموت

فلسفة الحياة والموت

كانَ شبحُ الموتِ المخيفُ الرّهيبُ يبدُو أمام النّاسِ جسيماً عظيماً، وبقدر ما كانت جسامتُه و خطرُه كانَ يبدُو في عين "اقبال" ضئيلاً مثلاً شيئاً لعلّه كانَ يري أنّ العقبةَ الكؤودَ في طريقِ رُقيّ المسلمين هي مخافةُ الموتِ ووجدَ أنّ خوف الموت معناه أمرٌ واحدٌ وهو ترجيح حياة الذلّة والعبوديه على موت الشرف والكرامة فحاول أن ينتزع هذا المرضَ النفسي من صدورِ أهل الاسلام مُبيّناً أنّ خوفَ الموت والايمان لايجتمعان في قلب واحد وأنّ الذين تسنّموا غارب العزّة والشرف هم الذين حملوا رؤوسهم على أكفهم في ميدان الكفاح لاتنخلع قلوبهم فرقاً ولا ترتعش عزائمهم

فلسفۂ حیات و موت

اقبالؔ علیہ الرحمہ نے اپنی بیمار قوم کی حالت پر نظر ڈال کر معلوم کر لیا کہ جو کہنہ امراض قوم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہیں اُن میں ایک خطرناک مرض موت کا وہ ڈر ہے جو ہر کس و ناکس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ یہ "خوفِ مرگ" وہ بلا ہے، کہ اگر یہ کسی قوم کو لگ جائے تو وہ قوم عزت اور آزادی کی موت پر بے عزتی اور غلامی کی زندگی کو ترجیح دیتی ہے اور پھر وہ پستی اور ذلت کے سب سے بڑے گڑھے میں گر جاتی ہے، جہاں اُس کو اغیار کی ٹھوکروں کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا، اقبالؔ نے اس خوف و ہراس کے خلاف مسلسل جہاد کیا ہے، اور بارہا یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم بہ حیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں موت سے ذرہ برابر بھی نہیں ڈرنا چاہیئے۔ انفرادی اور اجتماعی تاریخ

جبناً وإنما يقبلون على الموت إقبالهم على العرس مؤمنين بالفوز في الدنيا والسعادة بلقاء الله "قل هل تربصون بنا إلا إحدى الحسنيين" فإما النصر وإما موت فيه الفخر"

ثم يذكرنا بأسلافنا الماضين الذين ملكوا الممالك وأدالوا الدول، ووطئت خيولهم القلاع والحصون وما اشتروا هذا المجد إلا بدمائهم، فهو في قصيدته الشكوى يذكرنا بهذه الحقيقة في جلاء حيث يقول:

فوق الصوامع والكنائس صوتنا
قد كان يعلو بالأذان جهارا
تترنم الصحراء في إفريقيا
بصلاتنا وتسابق الأطيارا
كنا نقدم للسيوف صدورنا
لم نخش يوماً غاشماً جبارا
وكأن ظل السيف ظل حديقة

10371

کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہی شخص یا وہی گروہ کچھ نمایاں کام کر گیا ہے جس کا دل موت کے خوف سے بالکل مبرا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی انسان کی جسمانی زندگی پر سب سے بڑی مصیبت جو وارد ہو سکتی ہے وہ موت ہے اور اگر کوئی شخص اسی کو خاطر میں نہ لاتا ہو تو پھر اسکی زندگی کی گہرائیوں اور بلندیوں کی انتہا نہیں

اقبال ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے مشرق و مغرب پر اپنا سکہ بٹھا دیا اور انسانی تہذیب و تمدن کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز ترقیاں کیں، تو اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خوف کے احساس سے پاک تھے اور اپنی مہموں میں سر کو ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے چنانچہ "شکوہ" میں فرماتے ہیں:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے

خضراءَ تُنبِتُ حولَنا الأزهارا

ثُمَّ يقولُ:

لو فُرِّقَتِ الأجسادُ في آلامِها　　لم يلقَ غيرَ ثباتِنا الميدانُ
وكأنَّ نيرانَ المدافعِ في صدو　　رِ المؤمنينَ الرَّوحُ والريحانُ

ويصفُ ذلكَ المسلمَ الذي ينطلقُ كالسهمِ النافذِ إلى العدوِّ بعدَ أن يكبِّرَ تكبيرةَ الجهادِ في الميدانِ يقولُ:

ذلكَ المؤمنُ المجاهدُ يغشى　　غمرةَ الحربِ والردى يخشاهُ
تحتَ ظلِّ السيوفِ ما من قويٍّ　　درعُهُ لا إلهَ إلّا اللهُ

ويبيِّنُ لنا بعدَ ذلكَ أنَّ الحالةَ قد تغيَّرتْ، وأنَّ سُنَّةَ الأقوامِ قد تبدَّلتْ، واستحكمَ الجبنُ في قلوبِ الكثيرينَ من المسلمينَ وأصبحتْ وجوهُهم تصفرُّ اصفرارَ الشمسِ عندَ الأصيلِ إذا ذُكِرَ الموتُ أو الحربُ. ثُمَّ يخاطبُ الذينَ يمنعونَ الجهادَ، وبيَّنَ لهم أنَّ واعظَكم أصبحَ في المساجدِ غيرَ نافعٍ للأمَّةِ ولا مُغنٍ عنها في حياتِها الحاضرةِ شيئًا:

لم يبقَ في يدِ مسلمٍ درعٌ ولا

پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

ایک مردِ مسلمان کا یہ حال تھا کہ میدانِ کارزار میں نعرۂ تکبیر لگا کر مقابلہ کے لئے کود پڑتا تھا۔

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ

یا اب یہ حال ہے کہ موت کے اندیشہ سے ہمارا دل کانپتا رہتا ہے۔ اور ہمارا جسم ہلدی کی طرح زرد ہو جاتا ہے۔ اس خوف سے ہم اس قدر مغلوب ہو گئے ہیں کہ اگر زمانہ کے انقلاب نے ہمارے افراد کو شاہی کی بجائے خاکبازی پر مجبور کر دیا ہے۔ تو ہمارے مرشدان خود بیں قوم کو اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلانے کی بجائے فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ اسمیں اب تلوار کی ضرورت نہیں رہی جناب شیخ سے اقبال عرض کرتے ہیں کہ مسجد میں اب آپکا یہ وعظ غیر ضروری ہے کیونکہ:-

"تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں"

سيف يصول به ليوم جهاد

ولو أنه وجد السيوف فهل له

ذوق الخلود وحب الاستشهاد

من كان يجزع من منيته كاثر

هل يستطيب مصارع الأمجاد

إذا كان المرء مخلصًا لله حق الإخلاص وإذا كان واثقًا بأن الموت ليس إلا العقبة الأولى التي يجتازها المرء إلى الحظيرة الأبدية والمتعة بلقاء الله - أقول إذا كان الإيمان هكذا فلا محل لخوف الموت أما أولئك المضطرون الخائفون فهم شاكون في لقاء الله وفي الخلود ثم هم يعبدون المال ويؤثرون الحياة الدنيا ويظنون أن هذه الحياة المادية هي المرحلة الأخيرة للسعادة كذلك يخشون أن يموتوا فيحرموا.

وإقبال يحكم على هؤلاء بأنهم فقراء وأن نارهم لا تساوي التراب وهم على كل حال سيموتون طوعًا أو كرهًا.

ہوں بھی تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہے جس کا دل
کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر

(اور اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی مصوّرِ قومیات اس طرح ادا کر گئے ہیں:
گوشۂ مسجد میں کار شیخ اب بنتا نہیں — پیٹ کو تسکین پاتا ہے مگر تنتا نہیں)

اقبال متعدد موقعوں پر مختلف پیرایوں میں یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ موت کا ڈر صرف اُن ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس کو فنا کے کامل سمجھتے ہیں، اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن جو لوگ موت کو آئندہ زندگی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اُنہیں مرنے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے کہ جن کی حیات اور موت خدا کے لئے ہونی چاہئے تھی، وہ یا تو مال و زر کی محبت میں گرفتار ہیں یا موت کے خوف سے پریشان۔

ع

آں کہ بُود اللہ اورا ساز و برگ
فتنۂ اُو حبِّ مال و ترسِ مرگ

المرءُ من الحقّ كان اللهُ غايتَهُ   واللهُ كانَ لديهِ السمعَ والبصرا
والآنَ أضحى إلهُ المالِ كعبتَهُ   وخوفُهُ الموتَ أنساهُ وما شعرا

سيّانِ في الشركِ هذا عابدٌ ذهبًا
يسعى إلى جمعِهِ أو عابدٌ حجرًا
يا مؤمنًا بلقاءِ اللهِ ما لكَ في
ذُعرٍ من الموتِ قد أشبهتَ من كفرا
قد عادَ قلبُكَ ميتًا بين أضلعِهِ
كأنّهُ في حنايا الصدرِ قد قُبِرا
من كان يحسبُ أنّ الموتَ هاويةٌ
وأنّهُ عدمٌ يستأصلُ البشرا
فنارُ آمالِهِ ينحطُّ عنصرُها
إلى الترابِ ويلقى الموتَ محتقرًا

لمّا كان سمُّ الموتِ ساريًا في كلِّ الدماءِ البشريّة
فقد حاولَ إقبالُ أن يوجدَ من السمِّ نفسِهِ ترياقًا،

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ

سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ

مرگ را چون کافراں داند ہلاک

آتش او کم بہا مانند خاک

غرض اقبالؒ کو جب یقین ہو جاتا ہے

کہ موت کے خوف کا یہ زہر ہمارے خون میں

كيف استطاع أن يصل بمهارة إلى استخلاص هذا الدواء العجيب؟ إنه عمد إلى تذكيرنا بأن الموت أمر محتوم وأن لكل إنسان أجلاً محدوداً، وإذا كانت هذه النهاية قضاءً نافذاً في الخلائق، فالخوف منها لا يجدي فتيلاً، ومحاولة الفرار مع كونها جبناً وانحطاطاً في الوجدان مخالفة لحكم العقل وصواب التفكير أيضاً. فالعاقل لا يفكر في النجاة من القضاء المبرم، كما لا يفكر في أن ينفذ من أقطار السموات والأرض، وهو في هذه الحالة إلى الجنون أقرب وبالمجانين أشبه. ولهذا عرض لنا عدة صور تمثل فناء هذا الكون، وهي صور من حوادث الطبيعة تحمل إلينا فناءً بديعاً في منظرها الرهيب المخيف وتذكرنا عند مطالعتها بعوالم السماوات والأرض جميعاً في طريقها إلى الانتقال أو الزوال، تعالج فينا خوف الموت تنبهنا من غفلتنا وترفع عن أعيننا أغشية الغرور والركون إلى زهرة الدنيا وفتنتها.

ہدایت کر چکا ہے تو اُس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہ مختلف تریاق استعمال کرتے اور ہر طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ موت سے ہمیں کوئی ڈر نہ ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلے موت کے عالمگیر، اور اٹل ہونے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب موت سے کسی طرح مفر نہیں تو پھر اُس سے ڈرنا بے سود ہی نہیں، بلکہ خلافِ عقل بھی ہے۔ جو چیز آج نہیں تو کل آنے والی ہو، اُس سے بھاگ کر کہاں جائیں؟

ہر جاندار کے لئے موت کا ایک دن مقرر ہے اور کائنات کی ہر شے کبھی نہ کبھی فنا ہوگی۔

تحت نور الأفلاك عيش جميل
وأرى النور ينطق ويجول
وعلى كاهل المساء ترى للشم
س نعشا بكى عليه الأصيل
في سنا البدر للكواكب أكفا
ن توارى بها الشعاع النحيل
بينما هذه الجبال حصون
وإذا صخرها كثيب مهيل
وتقيم الأمواج في البحر أبرا
جا ومن أوجها الرفيع تزول
ورياح الخريف يكمن للزهـ
ـر هشيما وقد طواه الذبول
ليس زاد المسافرين سوى الخو
ف من الموت والحياة رحيل

بہ گردون مقام دلپذیر است
ولیکن مہر و ماہش زود میر است

بدوش شام نعش آفتابے
کواکب را کفن از ماہتابے

پر دکہسار چون ریگ روانے
دگرگون می شود دریا بہ آنے

گلان را در کمین باد خزان است
متاع کاروان از بیم جان است

رُبَّ لحنٍ فاقَ البلابلَ سحرًا
في ضميرِ الأوتارِ ماتَ جنينا
شررُ النارِ قبلَ أن يبلغَ المهدَ
توارى تحتَ الرمادِ دفينا

قطراتُ الندى على الوردِ تجري
لؤلؤًا سائلًا على مرجانِ
لم تكد تسعدُ النواظرُ حتى
بدّدَ الريحُ شملَها في ثوانِ

إنَّ كأسَ الردى تطوفُ على الدنـ
ـيا وتسقي أبناءَها أجمعينا
وبلا موعدٍ ودونَ انتظارٍ
تبعثُ الأولينَ والآخرينا
عالمُ الكونِ كلُّهُ عالمُ المحـ

نوا ناشنیده در چنگے بمیرد
شرر ناجسته در سنگے بمیرد

ز شبنم لاله را گوهر نماند
دمے ماند دمے دیگر نماند

فنا را بادهٔ هر جام کردند
چه بے دردانه او را عام کردند
تماشاگاه مرگ ناگهان را
جهان ماه و انجم نام کردند

والذي فيه مصرع العالمينا

وقد حاول أن يبعد من النفوس استسلامها إلى الدنيا وإخلادها إلى نعيمها الزائل، ودعانا إلى الحذر منها والاحتياط فيها، فقدم هذا التشبيه الرائع في هذه الأبيات-

مثل الحياة كطائر مترنم
غنى فأرقص حوله الأزهارا
ما كان أعذب لحنه لكنه
كالحلم حلق في الفضاء وطارا

لا يعلم الإنسان كيف أتى إلى
دنيا المتاعب أو متى يترحل
ما نحن في الأكوان إلا دوحة
أوراقها عما قليل تذبل

موت کے ہیر پھیر اور دنیا کے دوروزہ ہونے کیلئے ذیل کے اشعار میں نفیس تشبیہیں دی ہیں :-

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا

آہ کیا آئے ریاضؔ دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

يا أيها الحرص ابكِ في الدنيا دماً
دنياك ليس بها لحيٍّ منزلُ

إن الحياة شرارة لم تبتسم
إلّا لتجعلنا لها أحطابا
في عرس دنيانا مآتم للردى
تطوي شيوخاً في البلاد وشبابا

والمرء لم يبرح أسيراً حائراً
ما بين سرّ الأمس أو لغز الغدِ
إن الحياة على الأنام بخيلةٌ
بدوامها والعيش غير مخلّدِ
الموت فيها هيّنٌ كنسيمها
والعيش أصعب من منال الفرقدِ

اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار

(جیسا کہ حضرتِ ذوق نے فرمایا ہے:-
کیا اعتبار ہستیِ ناپائیدار کا   چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا)

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے بس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

اللهُ تعالى هُوَ المُتفرِّدُ بالبقاءِ وجميعُ العالمِ
لابُدَّ أن يفنى، وتفسيرُ حُلمِ المَوتِ جرى في
حياةِ الملوكِ والصعاليكِ والعظماءِ والسُّوقةِ
أمّا خُلودُ الإنسانِ فهُوَ مِن تقديرِ اللهِ في
الأزلِ إلّا أنّ هذا الهيكلَ الترابيَّ الناقِصَ
لابدَّ أن يمرَّ عليهِ الموتُ، ولابُدَّ أن يمُرَّ
الإنسانُ من هذا العالمِ المملوءِ بالحوادثِ
التي لم تترُكْ صحراءَ ولا مدينةً، ولم
ينجُ منهُ برٌّ ولا بحرٌ، وفي ذلكَ يقولُ:

الرّعدُ والبروقُ والزلازلُ
والقحطُ والآلامُ والنّوازلُ
بناتُ دُنيانا التي لا تلِدُ
إلّا خُطوبًا جمرُها متقِدُ
في الكوخِ والقصرِ وفي الصّحراءِ
والمُدُنِ المنيعةِ الشّمّاءِ

جب یہ معلوم ہوگیا کہ غنیم موت کی یورش کبھی ٹل نہیں سکتی۔ اور موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے تو پھر اس کا ڈر ہی کیا اور اس سے بھاگ کر کہاں جائیں۔

اس حقیقت پر پہنچ جانے کے بعد اقبال اب اس راز کا انکشاف کرنا چاہتے ہیں کہ خدا نے اس کائنات کو فانی بنایا ہی کیوں؟ اور انسان کو اس رنج و غم میں مبتلا ہونے پر مجبور کیوں کیا ہے؟

باری تعالیٰ خود غیر فانی ہے، پھر اس کی قدرت سے کیا بعید تھا کہ وہ اس دنیا کو اور اس کے ساتھ انسان کو بھی غیر فانی بناتا؟ اس کا جواب اسطرح دیتے ہیں کہ یہ دنیا اور آدم خاکی ابھی ناتمام ہیں یہ پختہ اسی وقت ہوتے ہیں جب موت کی آگ میں سے ہو کر نکلتے ہیں موت کا سوہان ہمارے اس ناتمام پیکر خاکی کو ہموار کرتا ہے۔

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

وفي رياض البلبل الرنان
وفي تلال البوم والغربان
يقتحم الموت بجيش القدر
حصونه فتخفو ويطش القيصر
إذا رأيت الموج في البحر سكن
فالموت كامن لإغراق السفن
لا نغم العود ولا شكوى الحزين
ولا ابتسام البشر أو دمع الأنين
ولا امتشاق السيف بين النازعين
ولا صدى التكبير بين الهاتفين
يعيد نبض القلب في الصد الخراب
أو يرجع النفس إذا حان الذهاب

تعد هذه الصور الشعرية التالية فخرا
لكل لغة نغما شجيا لكل لسان، فهو يوضح لنا
أن الآلام لابد منها لتمحيص الإنسانية، وعلى

رتبۂ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی
شورشِ بزمِ طرب کیا، عود کی تقریر کیا
دردمندانِ جہاں کا نالۂ شب گیر کیا
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

رنج و غم انسانی فطرت کی تکمیل کے لئے
ضروری ہیں کوئی نقش اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا
جب تک اس کے رنگ میں خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو۔ وہ بلبل

نرا انها تنضج الارواح القوية، ولا يمكن الوصول إلى الأفراح إلا بعد الأحزان، ولا تنقش الحكمة على القلب إلا بجروف من دمه، والبلبل الذى لم يعرف قسوة الخريف لا يحسن استقبال الربيع، والآلام هى الطريق إلى النور والدرجات العالية فى معراج العظمة والذى لم يعرف أنين المساء، والعاشق الذى حرم فى هواه من حسرة جواه، وقاطف الزهر الذى حافظ على يده سليمة من الشوك، والذى قضى طول عمره فى الرفاهية والترف، لم يكدح فى تحصيل علم ولم يكد فى اقتناء فن واحياء عبقرية اولئك جميعا محرومون إلى الأبد من الإحاطة بكنوز أسرار الحياة استخلاص الذهب من مناجمه العميقة.

يقدم لك هذه الأمثال الجميلة فى هذه القصيدة

إن كانت الحياة خمرا صافيا

ليغمرنا من رأسنا إلى القدم

ہی کیف جس نے کبھی خزاں نہ دیکھی ہو، وہ نغمہ ہی کیا جسمیں نالہ کی چاشنی نہیں۔ غم کے داغوں سے ہمارے سینے منور رہتے ہیں اور آہوں کی صیقل سے ہمارے دلوں کا زنگ دور رہتا ہے۔ جو گلچیں کانٹوں کی خلش سے بالکل ناواقف ہوں، اور جن عاشقوں نے کبھی ہجر کی کلفت، نہ سہی ہو وہ زندگی کی لذت سے محروم ہیں، اور زندگی کا راز اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔

غم کے اس نکتہ کو اقبال نے جن شعروں میں بیان کیا ہے، وہ فلسفیانہ معنویت اور ادبی لطافت کے لحاظ سے بہترین شمار کئے جا سکتے ہیں۔

یہ وہ شعر ہیں جو ہر زبان کے لئے مایۂ ناز ہیں :-

گو سراپا کیف و عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی

فَفِي الدُّمُوعِ لِلحَيَاةِ جَدْوَلُ
تَصْفُو بِهِ النَّفْسُ وَتَنْبُتُ الْهِمَمْ
إِنَّ حُبَابَ خَمْرَةِ الآمَالِ لَا
يَرْقُصُ إِلَّا فَوْقَ أَمْوَاجِ الأَلَمْ
وَاللهُ فِي حِكْمَتِهِ عَلَّمَنَا
أَنَّ انْشِرَاحَ الصَّدْرِ قَبْلَهُ "أَلَمْ"

عَوَاصِفُ الخَرِيفِ فِي لَيْلِ السُّهَادْ
عَلَّمَتِ البُلْبُلَ تَرْجِيعَ النَّغَمْ
دَمُ الأَمَانِي فِيهِ لِلشِّعْرِ مِدَادْ
وَفِي خُطُوبِ الدَّهْرِ أَسْفَارُ الحِكَمْ

نَشِيدُ هَذَا الكَوْنِ يَبْدُو نَاقِصًا
حَتَّى يُتِمَّ الدَّمْعُ أَلْحَانَ النَّشِيدْ
مَا أَيْقَظَ الشَّبَابَ مِنْ سُكْرِ الهَوَى

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے "الم" کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

(اس شعر میں ایک طرف "الم" تو غم کو تعبیر کرتا ہے۔ اور دوسری طرف قرآن شریف کے سورہ "ال م" کی طرف اشارہ کرتا ہے)

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

إلاَّ الأسى يُنبِّهُ العقلَ الشَّريدْ

يا رُبَّ شاكٍ صاغَ في آلامِهِ

جواهرَ الألحانِ مِن بحرِ الأنينْ

قد كانَ مثلَ العودِ في أحلامِهِ

فأيقظتْهُ ضرَباتُ العازفينْ

آلامُنا إلى العُلا أجنحةٌ

نعلو بها فوقَ مطاراتِ النُّسورْ

الرُّوحُ سرٌّ والحياةُ ظلمةٌ

وشعلةُ الآلامِ للأرواحِ نورْ

في خفقانِ القلبِ لحنٌ صامتٌ

لمْ تحكِهِ على غصونِها الطُّيورْ

إنَّ الذي لمْ يُبكِهِ أنَّاتُ المساءْ ... ولمْ تسامرْ عينُهُ نجمَ السَّماءْ

ولمْ يحطِّمْ جامَ قلبِهِ الأسى ... ولمْ يزرْ ظلامَ ليلِهِ البكاءْ

والسَّادرُ اللاَّعبُ طولَ عمرِهِ ... لمْ يستمعْ إلاَّ إلى عذابِ الغناءْ

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
سازِ یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

وَالعَاشِقُ المحروم فى غرامه
مِن لوعة الذكرى وحسرة الجفاء

وَمُجتنى الزّهر الّذى لم تختضب — يداه فى الشوك بحمرة الدّماءُ
جميعُ هؤلاء مهما سعدوا — من نعم الدُّنيا بأمن ورخاءُ
فإنّ أسرار الحياة تختفى — عنهم وهم عنها داوماً فى اختفاءُ

وإنه ليملكك العجب إذا رأيت الشعراء جميعاً فى ناحية و"اقبالا" وحده فى ناحية أخرى، فهم يتغنّون بالوصال ويذمّون الفراق ويتبرّمون بالأسفار ويحمدون الاقامة الهانئة، بينما هو يحبّ الرحلة والتجوال ويطرب لدمدمة الرّعود وأزيز الأمواج فيقول:

الوصلُ فى الحبّ غالٍ — وقيمةُ الهجر أغلى
ألوصلُ حلوٌ ولكن — عواقبُ الهجر أحلى
فى القرب موت الامانى — والعيش فيه فناء

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے،
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے،
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

پس جس طرح شبنم کی رفعت مذاقِ رم سے ہے اسی طرح انسان کی فطرت کی بلندی نوائے غم سے ہے۔
علامہ اقبال بار بار یہی سکھاتے ہیں۔ کہ انسان کو اس دنیا میں ہمیشہ حضر سے بڑھ کر سفر میں لذت ملتی ہے اور وصل سے بڑھ کر فراق میں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

والبعد فيه حياة ... يذكي ضياها الرجاء
إن اتقاد الأماني ... وحسن شد الطيور
وضجة الخلق سعياً ... في العالم المعمور
والسحب حين تراها ... تسقي الربا والسباب
والموج في البحر يعلو ... حتى يفوق الهضاب
وكل ما في البرايا ... من روعة وجلال
لولا يد الهجر فيه ... لم يزدهر بالجمال

يحدثنا "اقبال" عن الظواهر الكونية بلغة ساحرة، ويبين لنا مراراً "أن الربيع لا تتفتح أزهاره ولا تنضر أغصانه، ولا يبدو كل ذلك جميلاً في الحدائق إلا عندما تتساقط كل الأوراق لعواصف الخريف، وتبدو الطبيعة جافة صامتة نائمة حتى يوقظها ذالك الربيع بتغريد أطياره، كما مر في الصور السابقة، فيقول لنا إن ظواهر الحياة تعطينا درساً بليغاً، فليس الموت الاغروباً للشمس

گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق

موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

غرض اسی طرح وہ سمجھاتے ہیں کہ موت ہو یا رنج و غم، اُن کی شکایت کے لئے ہماری زبان نہیں کھل سکتی، کیونکہ اس گلستان میں نئے سرے سے بہار آنے کے لئے ضروری ہے کہ خزاں نے اُس کے پھولوں، اور پھلوں کو پامال کیا ہو۔

غم کی حقیقت کو آشکار کرنے کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ ظاہر پرست انسان جس کو موت کہتے ہیں، وہ دراصل فنا نہیں، بلکہ آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ لوگ جس کو زندگی کی شام سمجھتے ہیں، وہ دراصل اس کی دائمی صبح ہے۔

الروح، لم تستطع بعد ذلك في صبح الخلود الذي لا فناء بعده.

يزعم الجاهلون أن المنايا مغرب فيه للحياة انقضاء
أفلم ينظروا إلى الشمس يبدو نورها بعد ما طواها المساء
تغرب النفس ثم يشرق صبح فيه للنفس بالخلود القضاء

(١)

عندما أريد بناء مستشفى في الحجاز أراد إقبال أن يقدم إلينا من سحره بلسمًا يهون صدمة الموت ويوضح أن المرء بعد اجتياز تلك المرحلة يحيي حياة هانئة لا يحياها الخضر في عمره الطويل. ثم يهون احتمال الصدمة الأخيرة بعبارات سما فيها خياله وتصويره.

(٢)

فأنت ترى أن الشاعر ينظم القصيدة فإذا لم يجدها ملائمة لطبيعة روحه

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

(۱)

موت کی منزل سے گزرنے کے بعد انسان کو وہ زندگی حاصل ہوتی ہے، جو خضر کو اپنی عمر دراز میں نصیب نہیں چنانچہ جو لوگ حجاز میں ایک دواخانہ قائم کرنے کے سلسلے میں ان کے پاس جاتے ہیں انہیں یہ جواب ملتا ہے:

(۲)

موت کے رازِ نہاں کو سمجھنے کے لئے ایک اور مثال پر غور کیجئے ساحل دریا پہ کھڑے ہوئے ہم ہوا اور پانی کی اس مسلسل کش مکش کو دیکھتے

هذف منها أشياء وأثبت غيرها جديدة وأعمل فيها التغيير والتبديل - كذلك الرسام والمهندس والكاتب وكل الفنانين الذين نشاهد ابتكاراتهم أمام أعيننا والقدرة تبدع في فن الانسان وترقى به تحسيناً وتجميلاً - وليس الموت الاحالة يراد بها اصلاح النفس وإعلاؤها وتتجلى لك هذه الحقيقة واضحة في هذه الأبيات :

جس سے بلبلے پیدا ہوتے ہیں اور ٹوٹتے رہتے ہیں موج مضطر حباب کی تعمیر بھی کرتی ہے اور پھر بڑی بیدردی سے اس نقش کو مٹا کر اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ نقش کی یہ ناپائیداری اس بات کا ثبوت ہے کہ ہوا میں ان بلبلوں کو پیدا کرنے کی قوت ہے اگر یہ قوت تعمیر اس میں موجود نہ ہوتی، تو وہ اس کو توڑنے میں اس قدر بے پروا کبھی نہیں ہوتی؟ قدرت ایک کائنات کو فنا کرتی ہے تو دوسری کائنات پیدا بھی کر سکتی ہے —

ایک اچھا شاعر اپنے شعر سے خوش نہیں ہوتا تو اُسے چھوڑ کر دوسرا شعر کہتا ہے۔ ایک بڑا مصنف اپنے مضمون میں اس وقت تک کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے جب تک وہ اس کے دلخواہ معیار پر پورا نہ اُترے کوئی تصویر جب تک اچھی طرح تکمیل نہیں ہوتی پاتی مصور اس کو بدلتا رہتا ہے، پھر قدرت جو سب سے بڑی آرٹسٹ ہے اپنے نامکمل نقش سے کیسے طرح مطمئن ہو سکتی ہے۔ موت کی اس قدر لطیف توجیہہ اقبال رح کے سوا شاید کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے۔ اگر قدرت اس پیکر حیات کو فنا کرتی ہے، تو اس لیے کہ وہ ایک خوب تر پیکر بنانے کی آرزو مند ہے!

(١)

يا أُساةَ الحجازِ هلّا علمتُم
أنَّ برءَ الحياةِ أرضُ الحجازِ
إنَّ سرَّ الحياةِ يكمنُ في المو
تِ فيحكي حقيقةً في مجازِ
فرحُ المؤمنينَ في سكراتِ المو
تِ بقُربِ المهيمنِ المتعالي
هو أسمى من عيشةِ الخضرِ في الدُّن
يا طوالَ الدهورِ والأجيالِ
لِمَ جئتُم المؤمنينَ ببرءٍ
إنَّ إيمانَهم يداوي الجريحا
والذي ذاقَ من يدِ الوحيِ كأسًا
ليسَ يحتاجُ للدواءِ مسيحا

(۱)

میں نے کہا کہ موت کے پردہ میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمر دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا؟

(٢)

كلُّ كونٍ أبلتهُ أيدي الليالي

أحرقوه ليصنعوه جديداً

يُهدم البيتُ بعد حينٍ ليُبنى

منزلاً عالياً وقصراً مشيداً

في أحوالٍ عديدة وبأساليب مختلفة يبيّن شاعرنا أنّ الحياة تختفي ضعيفة لتظهر قويّة، فلا خوف من ذهاب شيء لأنّه سيظهر بصورة أجمل وأحسن كما مرّ في الصورة السابقة، وهو في هذه القطعة يتحدّث لنا عن تزلزل الحياة واضطرابها الدائم ليزيدنا يقيناً بها:-

في خضمّ الحياة يضطرب المو	ج ولا يستقرّ في أيّ حالِ
ثورانُ الحياةِ في الكونِ بادٍ	كلُّ شيءٍ به رهينُ انتقالِ
كلُّ ذراتِ هذه الأرضِ دوماً	في احتدامٍ وثورةٍ واشتعالِ
لا يغرّنك في الجبالِ سكونٌ	قد يجيء السكونُ بالزلزالِ

(۲)

چوں جہانِ کہنہ شود پاک بسوزند اورا
وز ہماں آب و گِل ایجادِ جہاں تیز کنند

متعدّد مرتبہ اور مختلف پیرایوں میں اقبالؒ اس حقیقت کو ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ دُنیا کی بے ثباتی ایک سطحی مظہر ہے جس کی تہ میں وہی زندگی کی روح کارفرما ہے۔

نقشِ حیات ہر مرتبہ مٹنے کے بعد ایک نئی شان سے اُبھرتا ہے۔ فنا اور عدم کی اس کثرت میں صرف زندگی وحدت جلوہ گر ہے۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

لیس ذاک الثبات فی الفلک الا سفر الأمن خدعة الأنظار
لا انتهاء فی المسیر قافلة الکو ن ولا تنتهی من الأسفار
عالم دائم التجدد متوا رل خطی لیس فی الطریق توان
لا یمل التغییر الا خمول لیس یدری ما لذة الطیران
الحیاة الجهاد والجد والوث بة والعزم ماضیاً والبکور
یقطف الزهر فی الفروع ولکن فوق تلک الفروع تنمو زهور

"اقبال" یعرف هذه الحقیقة، ویخلق بها من الطبیعة أجمل الصور وأحدث التشبیهات، لیزیل الیأس المظلمة بنور الأمل المشرق، وفی هذه الأبیات دقة هذه المعانی متجلیة تریک الحیاة ماثلة فی تغیرها من جمیل الی أجمل ومن حسن الا أحسن. فهو یخاطب النجم الذی یلمع فی ظلام حالک مضطربا فی القبة الزرقاء، قائلا لعلک تخشی فناء حیاتک باشراق الصباح، فلذالک تقضی لیلک فی فزع

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اُسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

"اقبال" اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں اور متعدد وجد آفریں تشبیہوں کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر جامِ فنا میں شرابِ زندگی کی مستی بھری ہوئی ہے۔ وہ ایک ستارہ کے ٹمٹمانے کو کانپنے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تجھے قمر کا خوف ہے۔ یا سحر کا خطرہ لگا ہوا ہے، تو جو یہ تمام رات کانپتے ہوئے گذارتا ہے تو شاید تجھے مآلِ حسن کی خبر مل گئی ہے، کہ جب چاند نکلے گا یا سحر ہوگی تو تیری ہستی نابود ہو جائے گی۔ پھر اس چمکنے والے مسافر کو سمجھاتے ہیں کہ اس دنیا کا آئین ہی ہے۔ کلی کی موت میں پھول کی آفرینش کا راز پوشیدہ ہے، اور لاکھوں ستاروں کے فنا ہونے

وَيقُول لِلْمُسَافِرِ فِي رِحْلَةِ الدُّنْيَا: إِنَّ مَوْتَ البَرَاعِمِ حَيَاةُ الزُّهُورِ۔

فَنَاءُ مَلَايِينِ النُّجُومِ مُبَشِّرٌ
بِأَنْوَارِ شَمْسٍ فِي السَّمٰوٰتِ تُولَدُ
وَنَوْمُ الرَّدَى سُكْرٌ سَيُعْقِبُ نَشْوَةً
بِخَمْرِ حَيَاةٍ فِي الخُلُودِ تُجَدَّدُ

وَتَوْدِيعُ أَيَّامِ البَرَاعِيمِ مُؤْذِنٌ ... بِخَلْقِ الزُّهُورِ البَاسِمَاتِ جَمَالَا
وَمَصْنَعُ هٰذَا الكَوْنِ بِالخَلْقِ دَائِرٌ ... فَإِنِّي أَرَى فِيهِ السُّكُونَ مُحَالَا
وَلَيْسَ سِوَى التَّغْيِيرِ فِي الكَوْنِ ثَابِتٌ ... يُغَيِّرُ حَالًا ثُمَّ يُنْشِئُ حَالَا

سَبَقَ لَنَا أَنْ تَحَدَّثَ إِقْبَالُ فِي صُوَرٍ مُخْتَلِفَةٍ عَنْ خُلُودِ الحَيَاةِ الإِنْسَانِيَّةِ، وَالآنَ تَأَمَّلْ إِلَى النَّهْرِ الَّذِي يَنْحَدِرُ مِنَ القِمَمِ المُرْتَفِعَةِ فِي مُلَاءَتِهِ البَيْضَاءِ هَابِطًا كَسَلَاسِلِ الفِضَّةِ مُرْسِلًا مِنْ خَرِيرِهِ نَغَمًا شَجِيًّا. يَتَعَلَّمُ مِنْهُ البُلْبُلُ تَرْجِيعَ أَلْحَانِهِ حَتَّى إِذَا هَبَطَ إِلَى السُّفُوحِ

سے ایک آفتاب کی ولادت واقع ہوتی ہے۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ایک ندی کو دیکھیے جب اس کی چادر پہاڑ کی بلندی سے وادی کی چٹانوں پر گرتی ہے۔ تو بظاہر اس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور پانی کی مسلسل رو کی بجائے آبشار کے قریب بکھری ہوئی بوندوں کی ایک دنیا نظر

وَالوِدْيَانِ تفرّقت قطراته كما يتفرّق الألاف وكأنك
لاترى الآن من ذلك الماءِ السلسال شيئًا فإذا سرت
قليلاً بعد ذلك بين الرّمال رأيت النهر متجلّيًا في
حُلاه الفضيّة يسقى من حوله الغابات والأعشاب
كذلك نهر الحياة يهبط من سمائها ثم يغيب حينًا
ليظهره منسّقًا فى مجرى الخلود۔

ويقدّم لنا هذه الصّورة الانيقة:۔

مِن رؤسِ الجبالِ ينحدِر النهـ ... ـرُ طروبًا بالأمواج عذب الأغاني
ينقل الطّير عنه بين الرّوابي ... ما يبثّ الغصون من ألحانِ

لخدودِ الحورِ الحسانِ تراهُ ... في صفاءِ البلّور حلو الخريرِ
ثمّ تمضى تلك المياه ضياعًا ... في تلالٍ منثورةٍ وصخورِ

قطراتٌ من النّمير طوتها ... في ثنايا الرّمال أيدى افترا ق
ثمّ تجرى بها الينابيع فى الأر ... ضِ فتحظى بعد النوى بالتّلاقِ

آتی ہے۔ لیکن آبشار سے تھوڑی دُور آگے وادی میں
بڑھیں تو پھر وہی ندی بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔
زندگی کی نہر بھی اسی طرح رواں ہے جس پر،
ان انسانی حادثات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

آئی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

فإذا النهر بعد ذلك في مجراه يحيي الزهور والأعشابا
وروضة تنبت الزمرد في الأر ض وتسقي النخيل والأعنابا

وحياة الإنسان نهر سماوي تولت بسيره الأقدار
كلما غاض ماؤه عاد فيا ضا فما ينقضي له تيار

شعلة النفس لا تصير رمادا
ضوؤها خالد على الأزمان
كل شيء يمضي وكل حياة
تنقضي غير جوهر الإنسان

ويطالعنا إقبال ببرهان عميق يحملنا على الإذعان والتصديق ويزيد الإيمان في أنفسنا جلاء ووضوحا، وذلك أن الحرص على الحياة وتنازع البقاء مركز في جميع طباع الأحياء، ومستقر في غرائز الكائنات، وكأن القدرة بذلك نقشت سر الخلود

ہجراں قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں بن گئی

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدّر ہو یہ وہ گوہر نہیں

حفظِ زندگی کی خواہش ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے اور کش مکش حیات دُنیا کا عام اصول ہے اس سے معلوم ہوا کہ خود قدرت کو بھی زندگی بہت محبوب ہے۔ پس اگر موت کے ہاتھوں سے نقشِ حیات مٹ سکتا تو

في الحياة وعموم الموت وشموله يدل لنا على أنه لا يؤثر في حقيقة الوجود، وأنه لا يزيد عن كونه أمراً عرضياً كالنوم الذي لا يؤثر في حيوية النائم، وإلى هذا المعنى يشير بقوله:

سرّ الخلود جرى مع الدم في العرو ... ق وخالط الأرواح والأحياء
لم يحينا الرحمن في الدنيا سدى ... وهو الحليم مشيئة وقضاء
لما رأيت الموت يشملنا علمـ ... ـت بأنه لن يستحيل فناء
الموت مثل النوم يبدأ سكرة ... وليعود صحواً دائماً ولقاء

في علوم الطبيعة لا توجد قيمة خاصة للحياة الإنسانية وليس للإنسان شأن خاص في هذه الكائنات ولكن الدين يعلمنا أنه أشرف المخلوقات بل إن هذه الكائنات خلقت لأجله، وإذا كان هذا صحيحاً فتأملوا إلى تلك النجوم التي تنير منذ ملايين السنين، والتي تعجز العقول دون حساب أعمارها فلنوازنها بالإنسان الذي هو أبعد نظراً من

قدرت اس کو کائنات میں اس طرح عام نہ کر دیتی۔ موت
کا اس طرح عالمگیر اور ارزاں ہونا ہی خود اس بات کی دلیل
ہے کہ زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

سائنس میں انسان کی ایک نہایت ہی معمولی ہستی ہے۔ جس کی اس کائنات میں کوئی بڑی اہمیت نہیں لیکن مذہب یہ سکھلاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ ساری کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے اگر یہ صحیح ہے تو ان ستاروں پر غور کیجئے جو کروڑوں برس سے منور ہیں جن کی عمر کا حساب لگاتے ہوئے ہماری عقل چکرا جاتی ہے۔ ان کا مقابلہ انسان سے کیجئے جس کی نظر ان ستاروں سے بھی آگے ہمیشہ ماورائے افلاک پر رہتی ہے

النجوم، ومما وراء الأفلاك وليست السماء في سعة فطرته الإنقطة، ومقصد حياته أعلى من مقامات الملائكة، ومن أنفاسه يتجلى النور في محافل القدرة، وقد حمل الأمانة التي عرضت على السموات والأرض والجبال فأبين أن يحملنها وأشفقن منها فهل تحيا هذه النجوم كل هذا العمر الطويل والإنسان الذي يساويها بقلامة ظفره يفنى في لحظة... ؟ وهل هو أقل من هذه الذرات اللامعة حتى تبقى هي في لمعانها ثم يمحى ضوءه في لمحة؟

يا أيها المسلم إن	الأرض والسماء لك
ضياءك القدسي أعـ	ـلى من شرارات الفلك
ما جئت في الدنيا لتفـ	ـنى وهي بالخلد تدوم
هل تصبح الشمس أقل	قيمة من النجوم؟

تأملوا إلى حقيقة البذور عندما غطيت بتراب الأرض، لم تضمحل تحت الثرى، ولم ينضب معين

جس کی وسعتِ فطرت میں آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں، ــــــــــــــ

جس کی زندگی کا مقصد فرشتوں سے ــــــــــــــ

بھی زیادہ پاکیزہ ہے، جس کے دم سے محفلِ قدرت میں روشنی ہے، جس نے اُس بارِ امانت کو اٹھایا جس کے متحمل زمین اور آسمان بھی نہیں ہو سکے۔

اگر ستاروں کی زندگی اس قدر طویل ہے تو انسان جس کا ناخن سازِ ہستی کو چھیڑتا ہے کیا وہ ایک لحظہ میں فنا ہو جائے گا؟ کیا وہ ان چمکدار ذرّوں سے بھی کم قیمت ہے کہ ستارے تو اتنے عرصہ تک چمکتے رہیں، اور انسان کی ہستی ایک لمحہ میں فنا ہو جائے؟

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا؟

پھول کے ایک بیج کی حقیقت پر غور کیجیے۔ اس کو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ سردیٔ مرقد سے افسردہ نہیں ہوتا، خاک میں دبنے

حيويتها وهي دفينة في ترابها بل كانت في تفاعلها مضطربة للنشوة والنماء وشعلة الحياة المستورة في وجودها لم تنطفئ من تلك الظلمات بل نمت وترعرعت وتفتحت أكمامها بالزهور الباسمات عن أجمل الألوان وعطر النسيم حتى أوحت الى نفس الشاعر هذه الأبيات:-

لقد دفنوا في التراب البذور
فلم تفن في لحدها الهامد
ولم تنطفئ نارها في الحجارة
على طول مرقدها البارد

لقد نسجت للحياة القباء
وصاغت من الزهر أبهى حلاه
نمى غصنها زاهراً واستفادت
من الموت تجديد ذوق الحياة

کے بعد بھی اُس کا سوز گم نہیں ہو جاتا۔ زیرِ خاک بھی وہ نشو و نما کے واسطے بے تاب رہتا ہے۔ اس کی ہستی میں زندگی کا جو شعلہ پنہاں ہے۔ وہ مٹی کے اس انبار سے نہیں دب سکتا، خود نمائی اور خود افزائی کے لئے وہ یہاں تک مجبور ہے کہ آخر کار بیج کا یہ دانہ گُل کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے:

تخمِ گُل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بیخواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

الشاعر الواحد يعبّر عن المعنى الواحد بأساليب مختلفة، ولا صبر عليه من تكرار المعنى الذي يفتن له في تجديد الحلة وتجميل الأسلوب، وهذا هو شأن إقبال. فقد عبّر لنا عن مساء الموت وصبح الخلود في الصورة السابقة، ثم يعيد هذا المعنى في ثوب آخر حين يعرض علينا الصباح مقبلاً في حلته الباهرة يوقظ العالم لاستقبال الحياة بنشوة وأمل، وما الموت إلا صورة لهذا المشهد الطبيعي وهاك هذه الأبيات:

حينما يسفر الصباح نديًّا ؛ ناصعًا في مواكب الإشراق
يغسل النور في المشارق أدرا ن الدياجي عن حلة الآفاق

وليطير الكرى وينبت العشـ ـب ولتصحو عزائم الكائنات
ويهب الأحياء في البر والبحـ ـر ليستقبلوا عروس الحياة

رات کے وقت ساری کائنات اس طرح مراقبے میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر چیز پر موت کا جادو چل گیا ہے۔ لیکن جب صبح ہوتی ہے، تو اس دنیا کا ذرّہ ذرّہ نئی زندگی لیے ہوئے بیدار ہوتا ہے۔ پس اگر ہر شام کے بعد صبح کا ہونا لازمی ہے تو پھر ہماری شب عدم کی صبح کیوں نہ ہو؟

کس قدر روح پرور اشعار ہیں:

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار

وَإِذَا كَانَ لِلْخَلَائِقِ نَامُوسٌ ... يُرِينَا الصَّبَاحَ بَعْدَ الْمَسَاءِ
فَكَذَا تَذْهَبُ الْحَيَاةُ وَلَكِنْ ... بَعْدَ لَيْلِ الْحِمَامِ صُبْحُ الْبَقَاءِ

لَيْسَتْ حَلَقَاتُ الْحَيَاةِ الْإِنْسَانِيَّةِ ضَيِّقَةً إِلَى حَدِّ أَنْ تَرْتَبِطَ بِالْهَيْكَلِ التُّرَابِي وُجُوداً وَعَدَماً الدُّنْيَا أَوَّلُ الْمَنَازِلِ وَلَيْسَتْ آخِرَهَا هَذِهِ الْقُبَّةُ الزَّرْقَاءُ لَيْسَتْ نِهَايَةَ وُجُودِنَا، وَلَيْسَ الْجِسْمُ إِلَّا وَكْراً لِهَذِهِ الْأَرْوَاحِ، فَإِذَا ذَهَبَ الْوَكْرُ يُخْلَقُ وَكْرٌ آخَرُ هَذَا هُوَ عَمَلُ الْفِطْرَةِ الَّتِي لَا تَتَقَيَّدُ بِسَلَاسِلِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَقَدْ حَدَّثَنَا إِقْبَالُ عَنْ هَذَا الْعَمَلِ حُسْنَ الْحَدِيثِ وَبَيَّنَ أَنَّ الْمُسْلِمَ عَظِيمُ الشَّأْنِ فِي الْخُلُودِ وَأَنَّهُ أَقْوَى وَأَعْظَمُ مِنْ هَذَا الْكَوْنِ الْمَحْدُودِ:

١- فَوْقَ السَّمَاءِ أَيُّهَا الْحُرُّ ... سَمَوَاتٌ أُخَرُ
وَفَوْقَ هَذَا الْمَجْدِ فِي ... دُنْيَاكَ مَجْدٌ مُنْتَظَرُ
بَعْدَ الْحَيَاةِ أَيُّهَا الْمُسْلِمُ ... تَبْدَأُ الْحَيَاةُ
صَانِعُ دُنْيَاكَ وَآخِرَتِكَ ... مَعاً هُوَ الْإِلَهُ

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

انسان کا حلقۂ فکر اس قدر تنگ نہیں کہ وہ اس جسمِ خاکی کو ہماری حقیقی ہستی کے لیے ناگزیر سمجھے، یہ نورِ فطرت ہر شیشہ میں اسی طرح جلوہ گر ہے۔ اس دنیا میں ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تو عشق کی پہلی منزل ہے، اس سے آگے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔

ذیل کی نظم زبان اور خیالات کے لحاظ سے تخلیقی آرٹ کی ایک بہترین مثال ہے۔

(۱)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

٢- إنّ البرايا دولٌ بها القضاءُ حائلُ
لم ينقطعْ من الطريـ ـقِ هذهِ القوافلُ

٣- وكم وراءَ عالمِكْ أكوانُ من عوالمِ
فلا تضعْ حدًّا لما في النفسِ من عزائمِ
كلُّ الذي تعرفُهُ ليس نهايةَ الوجودْ
فكم توارتْ مدنٌ وراءَ هذهِ الحدودْ

٤- إن هُدِمَ العشُّ ففي الـ ـبستانِ تنشأ الوكورْ
طِرْ للخلودِ مؤمنًا ليسَ الجمودُ للطيورْ

٥- فبعدَ هذا الظلِّ يا بلبلُ ماءٌ وهواءْ
وجنّةٌ أخرى يطيـ ـبُ في رياضِها الغناءْ

٦- الليلُ والنهارُ لكْ آمالُ لا يتّسعانْ

(۲)

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

(۳)

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

(۴)

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

(۵)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

(۶)

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

فاطلب مقاماً للعلى فوق الزمان والمكان

تذهب الأفراد ويبقى النسل والأمة. ويجب على المسلمين أن يذكروا أن بقاءهم في هذه الدنيا ضروري لتكميل حكمة الله والرسالة التي لم تتم في أمتي الخليل والكليم يتمها أذان المسلم. إن النسيم العليل يمر على البراعم ولكن الزهور لا تستكمل نموها حتى تدمي يد البستاني أغصانها وأشجارها بالتشذيب والصاعقة تسقط على وكر القمري فيموت والبلبل يقع فريسة في شرك الصياد. ولكن رونق الربيع وآلاف الطيور تقبل وتنشد ألحانها وتطير والبستان لا يزال قائماً.

إذا سقطت زهرة في الربيع

فكم في بساتينه من زهور

ويا رب لؤلؤة حطموها

کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

اس کے علاوہ افراد مٹ سکتے ہیں لیکن نسل و قوم باقی رہتی ہے
مسلمانوں کو خصوصاً یاد رکھنا چاہیئے کہ مقصد الٰہی کی تکمیل کے لیے
ابھی اس دنیا میں ان کی ضرورت باقی ہے۔ وہ راز جو خلیل اور کلیم کی آنکھ
سے پوشیدہ رہا صرف مسلمانوں کی اذان سے ہی فاش ہو سکتا ہے۔ با
نسیم کی روح آفرینیوں کی بدولت کلی شاخ گل سے چٹکتی ہے لیکن ابھی
پوری طرح کھلنے بھی نہیں پاتی کہ گلچیں کے ظالم ہاتھوں اس کا خون ہو جا
ہے اور بوئے گل کی طرح اس کو چمن سے باہر نکل جانا پڑتا ہے۔ قمری
کے آشیاں پر بجلی گر پڑتی ہے، بلبل صیاد کے دام میں پھنس جاتی ہے لیکن
بہار کی رونق کم نہیں ہوتی، ہزاروں جانور اپنی اپنی بولی بول کر اڑ جاتے
ہیں، لیکن یہ چمن اسی طرح قائم رہتا ہے

فصل گل از نسترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است
کان گوهر پروردے گوهر گرے

لترفع في التاج أو في النجوم

يغيب الصباح من المشرقين ويمضي المساء من المغربين
ومازال يقبل هذا وذاك جديدين في حلة النيرين

مئات السنين مضت في الحياة
وما استنفدت بحر أزمانها

وكم أفرغ الشاربون الكؤوس وما زالت الخمر في حانها
وكم زال أمس فوافى غد وكم أشرق النور بعد الظلم
يزول عن الأرض أفرادها وتبقى الشعوب بها والأمم

المسلم آية من آيات الله، وآيات الله لا تزول.

المسلم باق ليرفع العلم ويتسنم خلافة الأرض، وأعداء الإسلام يحاولون أن يسقط هذا العلم وأن يذهب المسلمون؛ ولكن هؤلاء الأعداء أنفسهم كثيرا ما يشاهدون نور الإسلام فيصبحون في طليعة أنصاره وحماته، فينقلب عدوانهم حماية ورعاية.

وإذا سقطت بعض مواطن المسلمين فالمسلم سيبقى و

کم نگردد از شکستِ گوہرے

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت — جام ہا صد روز از خمِ ایام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است — دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است

ہم چنان از فردہائے بے سپر
ہست تقویمِ اُمم پایندہ تر

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است،

اُمتِ مرحومہ خدا کی ایک نشانی ہے اور اغیار اس نورِ الٰہی کو بجھانے کے درپے ہیں لیکن باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور جب تک کہ تخلیقِ عالم کے مقصد کی تکمیل نہ ہو جائے اور صداقت اور توحید کا پرچم ساری دنیا پر نہ لہرانے لگے۔ یہ اُمت اُسی طرح زندہ رہے گی۔

الإسلام لن يفنى:

ذالك المسلم من أندلس　　سيعيد العزم في الشمس مكانه

من سقاه العشق يوما خمره　　لم يعد في السكر محتاجا لحانه

والليالي علمتنا عبرا　　في الذي مر به غزو التتار

كفروا ثم اجتلوا نور الهدى　　فاهتدوا للنار أو ذاك المنار

عرفوا الإسلام فانقادوا له　　وغدا أعداؤه ركن حماه

عزت الكعبة وانهار الصنم　　وهوى الشرك بتوحيد الإله

إن هذا العصر ليل فانير　　أيها المسلم ليل الحائرين

وسفين الحق في لج الهوى　　لا يرى غيرك ربان السفين

أنت كنز الدر والياقوت في　　موجة الدنيا وإن لم يعرفوك

محفل الأجيال محتاج إلى　　صوتك العالي وإن لم يسمعوك

ليس في الوقت فراغ فاعتزم　　واملأ الدنيا بأعمال شريفة

أنت نور الأرض تهدي أهلها　　لن يرى غيرك في الأرض خليفة

مازال المسلم ممتحنا بالشدائد والحوادث الجسام و

لقد انهالت على المسلمين مصائب الزمن، ورأوا من البلايا

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں مے خانے سے
ہے عیاں شورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے
چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حقیقت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آسماں ہمارے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہا اور ہمارے سر پر وہ وہ مصیبتیں نازل کیں جو یونان اور روما نے بھی

مَا ضَاعَ مِثْلِهِ مِلْكُ جَمِيعِ الْأُمَمِ السَّابِقَةِ مِنْ إِغْرِيقٍ وَيُونَانَ وَرُومَانَ وَفَرَاعِنَةٍ؛ وَلَكِنِ الْحَوَادِثُ ارْتَدَّتْ عَنِ الْمُسْلِمِ كَمَا تَرْتَدُّ الْحَصْبَاءُ عَنِ الْقَلْعَةِ الشَّمَّاءِ؛ وَكُلُّ مُصِيبَةٍ تَنْزِلُ بِالْمُسْلِمِ تَصِيرُ عَامِلًا عَلَى إِسْعَادِهِ، وَسَبَبًا فِي رُقِيِّهِ:

نَحْنُ نُهْدِي الْخَلْقَ زَهْرًا وَثِمَارًا ... وَسِوَانَا يَبْعَثُ النَّارَ ضِرَامًا
كُلَّ نُمْرُودٍ إِذَا أَوْقَدَ نَارًا ... عَادَتِ النِّيرَانُ بَرْدًا وَسَلَامًا

نَحْنُ بِالْإِيمَانِ نَبْنِي عِزَّنَا ... لَا نُبَالِي الْهَوْلَ أَوْ نَخْشَى الصِّعَابَا
وَإِذَا الْبَاغِي رَمَى فِي عُرْسِنَا ... جَذْوَةَ الظُّلْمِ جَعَلْنَاهَا تُرَابًا

ذَهَبَ الْيُونَانُ وَالرُّومَانُ وَالْفُرْسُ قِدَمًا ... وَفَرَاعِينُ الزَّمَانِ
وَهُدَى الْإِسْلَامِ مَا زَالَ عَلَى ... قِمَّةِ الدُّنْيَا يُدَوِّي بِالْأَذَانِ

هَا هُوَ يُذَكِّرُنَا بِأَنَّ الْمُمَثِّلَ لِوُجُودِ الْمِلَّةِ هُوَ الْأُمَّةُ، وَأَمَّا الْأَفْرَادُ فَهُمْ زَائِلُونَ. بِهَذَا يَدْعُو الْمُسْلِمَ إِلَى أَنْ

نہیں دیکھیں اور جنکے باعث سطوت مسلم خاک و خون میں تڑپنے لگی لیکن اسی چرخ کج رفتار کو معلوم ہے کہ ہم اس امتحان سے کبھی نہیں گھبرائے ہر مشکل کا مقابلہ کیا، اور ابراہیم خلیل اللہ کیطرح آگ کو بھی اپنے لئے گلزار بنالیا پھر اگرچہ مصر و بابل مٹ گئے نہ تو صفحۂ دہر پر اُن کا نشان باقی ہے اور نہ دفتر ہستی میں ان کی داستان لیکن مسلم کی اذان کی آواز فضائے عالم میں اب بھی اُسی طرح گونجتی ہے۔

از تہ آتش بر انداز یم گُل

نارِ ہر نمرود را سازیم گُل

شعلہ ہائے انقلاب روزگار

چوں بباغ ما رسد گردد غبار

رومیان را گرم بازاری نماند

آں جہاں گیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیان در خون نشست

رونقِ خمخانۂ یونان شکست

مصر ہم در امتحان ناکام ماند

استخوانِ او تہِ اہرام ماند

در جہان بانگِ اذاں بود ست و ہست

ملتِ اسلامیان بود ست و ہست

اجل کا ہاتھ ہماری قوم کو نہیں چھو سکتا اور چونکہ قوم کی ہستی میں ہی

يبذل نفسه فرداً لكي يحيي دولة وشعباً. ثم يذكره بأصله الأزلي وفرعه الأبدي؛ ولِيضع نار اليقين في صدر المسلم محمولة إليه في ثنايا هذه الأبيات:

مُعيشةُ الفردِ خيالٌ والبقاءُ للأمم

فكن فداءَ المبدأِ الـ أعلى إذا نادى العلم

منزلُك العلويُّ لا تحجُبُ صرحَهُ الغيوم

أنت من الجيش الذي غبار خيله النجوم

في العالم الأوّل من مطالع الأنوار كنتَ

والناطقُ الأخيرُ في رسالة الرحمن أنتَ

قم وانشر التوحيد في الدنيا ووحِّد الأمم

فأنت خيرُ من دعا وأنت خيرُ من حكم

المنظر الذي يروّع الإنسان هو حركة الموت التي تسكن بعدها الأعضاء وتبرد الحواس؛ فحينما يراك إقبال مرتعداً مذعوراً لهذا المشهد الرهيب يضع على قلبك بردَ العزاء، ويبيّن لك أن ملك الموت

افراد کو حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اسی لیئے قوم کی خاطر قربان ہو جانے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیئے۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ایک سچے عاشق کو موت سے کچھ ڈر نہیں کیونکہ اگرچہ موت ہر چیز پر غالب آتی ہے لیکن عشق پر غالب نہیں آتی اور اقبالؒ بتاتے ہیں کہ موت کا فرشتہ اگرچہ ہمارے جسم سے جان نکال لیتا ہے لیکن ہمارے وجود کے مرکز تک اس کی رسائی نہیں ہوتی ہمارا زندہ دل قبر میں بھی بے قرار رہتا ہے اس جسم خاکی

لا يُميتُ الأرواحَ وإن أفنى عالمَ الأشباحِ:

يعصفُ الموتُ بالجسومِ ولكن ... ليسَ يُفني من قوةِ النفسِ شيئًا
تَصعدُ الروحُ للخلودِ ويبقى ... عالمُ الغيبِ والشهادةِ حيًّا

لا تمتْ من مخافةِ الموتِ جهلًا
فبغيرِ الأنفاسِ روحُكَ تحيا

ليسَ الإنسان من هذا العالم في شيءٍ فجميع ما حوله من المظاهر المادية تضمحلُّ وتذهبُ مع الهشيم ويبقى بعد ذلك جوهر الإنسان ساطعًا يحدّثنا عنه "إقبال".

هوى سريرُ كيقباذ ... والطوى إكليلُ جم
وأصبحَ الكلُّ رمادًا ... مثلَ هيكلِ الصنم
أمّا أنا فلستُ أدري ... أينَ يعلو نظري
أنا ترابٌ غيرَ أنَّ ... الشمسَ دونَ جوهري

في سكونِ السَّحَرِ تتفتّحُ قلوبُ الشعراءِ كما تتفتّحُ الأزهارُ لتحتضنَ النسيمَ ولتستقبلَ الندى

کہ مر جانے سے جان نہیں مرتی۔ دل حلقۂ بود و عدم سے آزاد ہے ؎

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے — اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا — ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقیست غم نیست

دنیا کی ساری چیزیں فنا ہو جائیں لیکن جوہر انسانی کی حقیقت کچھ اور ہے اس کو فنا ممکن نہیں۔

سر کیقباد، اکلیل جم خاک
کلیسا و بتستان حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست
نگاہم برتر از گردوں، تنم خاک

سحر کے وقت شاعر کے حساس دل میں ہر جاندار اور بے جان چیز سے پیام قبول کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے وہ صبح کے تاروں

وتفنى مشاعر ذلك القلب على الأحياء وغير الأحياء حتى تتسع للوجود كله بما فيه من ماض وحاضر فينظر الى تل من الرماد فيسمع من صمته حزن الماضي ويقول إنني كنت شجرة مشتعلة يأوي المدلج إلى ناري، ثم أطفأتني عواصف الصحراء. هكذا أسمع "إقبال" سرعان ما تلفت فاذا نهر سار قد صفت مياهه كأنها مرآة النجوم السماء فعادت نفسه الحزينة إلى الأمل بعد اليأس، والرجاء بعد الخوف وحدث عن هذه المشاعر بقوله:-

قد تغنى قلبي فأسمع أذني
نغما فاق رنة الأوتار
وكأني رأيت نهر حياتي
نابعا من صفاء عين سار
أزلي بعنصري أبدي

کو اپنا دردِ دل سنانے کے لئے فضائے دشت میں گھوم رہا ہے۔ راکھ کے ایک ڈھیر سے اُس کو کچھ سرگوشیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ راکھ بادِ صبا سے کہہ رہی ہے کہ "کبھی میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ تھی جس سے راہرو اپنے جسم کے لئے گرمی حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس صحرا کی ہواؤں نے میری چنگاریوں کو ٹھنڈا کر دیا تو آہستہ چل تاکہ میرے یہ افسردہ ذرے بکھر نہ جائیں۔ ورنہ جس قافلے کے سوز و گداز کا میں نشان ہوں۔ اُس کی یاد بھی باقی نہ رہے گی" یہ سُن کر شاعر کو اپنی حالت یاد آجاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی ہستی بھی خاک سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس رہگذر میں برباد ہے۔ حوادث کی تباہ کاریوں کے خیال سے اُس کی آنکھ سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اتنے میں اُس کے کان میں دل کی یہ آواز پہنچتی ہے کہ تو اس مشتِ خاک کی تباہی پر کیوں افسوس کرتا ہے؟ ازل اور ابد میرے ہی رہینِ منت ہیں اور میری کوئی انتہا نہیں۔

بگوشش من رسید از دل سرودے
کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم
ازل تاب و تب پیشینۂ من

مَنزِلِي فِي الخُلُودِ فَوقَ المَنَازِل
إِنَّ جِسمِي مِنَ التُّرَابِ وَلٰكِن
رُوحِيَ البَحرُ مَا لَهُ مِن سَاحِل

مادام المرءُ لا يقف على حقيقة نفسه، وما دام يقيس الجوهر الإنسانى با لهيكل الترابى، فانّه كل وقت مستهدف للخوف من ساعته الأخيرة. واقبال يندد بهؤلاء ويصفهم بهذا البيت -

يُلازِمُ خَوفُ المَوتِ كُلَّ مُضَلَّلٍ
يَرَى أَنَّ مِقيَاسَ الحَيَاةِ تُرَابُ

إِنَّ الَّذِى يُحَافظ على كمال ذاتيته يحيى بعوامل المَوت؛ هٰذِهِ الكواكبُ والأقمار تزول، ولكن نشوة الذاتية لا يخبو لمعانها إلى الأبد.

وَالَّذِى تمكن من كمال ذاتيته ولضج إيمانه لا يخاف مِنَ الموتِ القادم. وقد أفصحنا إقبال مرارًا أن ارتكاب أقبح الذنوب أساسه الخوف، ولا

ادب از ذوق و شوق انتظارم

میندیش از کفِ خاکے میندیش

بجانِ تو کہ من پایاں ندارم

من کی دنیا میں فنا کا گزر نہیں، انسان موت کے غم میں اسی لئے گھلا جا رہا ہے کہ وہ اپنی اصلیت کو پیکرِ خاکی پر منطبق کرتا ہے جب تک ہم اپنی حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں اس غمِ مرگ سے نجات ممکن نہیں ہے

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن

کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

انسان اگر اپنی خودی کی نگہداشت کرے تو مرنے کے باوجود زندہ رہتا ہے یہ چاند ستارے اور کائنات فنا ہو جائیں گے۔ لیکن خودی کا نشہ وہ ہے جو ابد تک نہیں اُترے گا۔

خودی جب پختہ ہو جائے تو موت سے پاک ہوتی ہے جس نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا۔ اُسے آنے والی موت کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ اقبال نے بارہا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ انسان کی تمام برائیوں کی جڑ خوف اور خصوصاً موت کا

سيّما خوف الموت هذه الخشية ولا يتبعها من يأس وقنوط يسمّيها "أمّ الخبائث" وكثيرًا ما وازن بين القلوب الآمنة الثابتة وبيّن أنّ الواثق بنفسه يهجم على الأسد كالمعز، والخائف يفرّ من الغزال كأنّ أسدًا تعقّبه. ولو لم تكن في قلوبنا شائبة الوجل لعبرنا البحر كأنّه صحراء، وأمّا الفزع فيرينا في كل موجة تمساحًا:

يعلو على الموت من تسمو إرادته … وفي عزيمته صدق وإيمان
عمر الكواكب محدود وأنت إلى … غير انتهاء بكأس الخلد ريّان
يرى الجبان غزال القاع مرتعدًا … كأنّه أسد في القاع ضرغام
والحرّ يلقى أسود الغيل مبتسمًا … حتّى كأنّ أسود الغيل أغنام
إنّ الشجاع يخوض البحر مقتحمًا … كأنّما الموج أزهار وأدواح
وموجة النهر في عين الجبان بها … غول وحوت وتنّين وتمساح
هل يدفع الخوف آجالًا محتّمة … يجري على الخلق في أحكامها القدر
ومن زكت نفسه بالطهر وكملت … فليس يلحقها من موتها ضرر

خوف ہے جو ت اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ناامیدی کو وہ "اُم الخبائث" کہتے ہیں۔ ڈر سے کانپنے والے اور نڈر دلوں کا انھوں نے اکثر مقابلہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ نڈر انسان شیر کو بھی بکری سمجھ کر اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور ڈرپوک شخص ہرن سے بھی ایسا بھاگتا ہے۔ گویا شیر اس کے تعاقب میں ہے۔ اگر ہمارے دل میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں تو سمندر کو بھی ہم صحرا کی طرح بے کھٹکے پار کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم خوف وہراس سے مغلوب ہیں تو سمندر کی ہر موج میں ہم کو مگرمچھ دکھائی دیتا ہے۔

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است
دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحراست
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است
ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

وَيقُولُ :

اَلمُؤمِنُونَ عَلَى عِنَا ... بِهِ رَبِّهِم يَتَوَكَّلُونَ

لَا خَوْفَ يُفزِعُهُمْ وَلَا ... هُمْ فِي الحَوادِث يَحْزَنُونَ

لَو مَرَّ أَضْعَفُهُمْ عَلَى ... فِرْعَوْنَ يَجْتَزُّ الرُّؤُوسَا

لَأَرَاكَ فِي الإِفْصَاحِ هَا ... رُونًا وَفِي الإِيمَانِ مُوسَى

إِنِّي رَأَيْتُ الخَوْفَ فِي ... الدُّنْيَا عَدُوًّا لِلعَمَلْ

هُوَ مُطْفِئٌ نُورَ الرَّجَا ... ءِ وَسَالِبٌ كَنْزَ الأَمَلْ

يَرْمِي الإِرَادَةَ بِالتَّنَزُّ ... زُلِ وَالعَزِيمَةَ بِالخَوَرْ

وَمَنِ احْتَوَاهُ الخَوْفُ لَا ... يَجْنِي مِنَ الرَّوْضِ الثَّمَرْ

اَلمُؤمِنُ الوَثَّابُ تَغْـ ... ـرَقُ وَهُوَ فِي ظِلِّ السَّفِينَة

تَلْقَاهُ عِنْدَ شَبَابِهِ ... هَرِمًا قَدِ انْحَطَّتْ قُوَاهُ

وَتَعَثَّرَتْ قَدَمَاهُ ... قَبْلَ الخَطْوِ وَارْتَعَشَتْ يَدَاهُ

فِي السِّلْمِ قَبْلَ الحَرْبِ مَسْـ ... ـلُوبُ الشَّجَاعَةِ حَائِرُ

اَلصَّبْرُ عَنْهُ نَافِرٌ ... وَاللُّبُّ مِنْهُ طَائِرُ

أَعْدَاؤُكُمْ يَخْشَوْنَ سَيْـ ... ـفَ يَقِينِكُمْ قَبْلَ السُّيُوفْ

اقبالؒ علیہ الرحمت بے خوف زندگی کی طرف ہمیں واپس لانا چاہتے ہیں، وہ خداوند کریم کا وعدہ یاد دلاتے ہیں۔ کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کے لیئے کوئی ڈر نہیں جس کے دل میں ایمان کی قوت ہو، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح فرعون سے مقابلہ کرنے کے لیئے تیار ہو جاتا ہے موت کا ڈر عمل کا دشمن ہے۔

یہ ڈر ہماری زندگی کے قافلے پر چھاپہ مارتا ہے اس سے ہمارے محکم ارادے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور ہماری بلند ہمت اندیشوں سے گھر جاتی ہے جب اس ڈر کا بیج ہمارے مزرع دل میں بو دیا جاتا ہے۔ تو زندگی کی نشوونما رک جاتی ہے، اس سے ہمارے دلوں میں لرزہ اور ہاتھوں میں رعشہ پڑ جاتا ہے ہمارے پاؤں سے طاقت رفتار اور ہمارے دماغ سے فکر کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔

جب دشمن ہم کو خوف زدہ دیکھتے ہیں تو شاخ گل کی طرح توڑ کر ہم کو باغ سے پھینک دیتے ہیں، ان کی تلوار زیادہ قوت کے ساتھ

ومرامهم أن تسرعوا   بالخوف من قبل الحتوف
حتى تروا نظراتهم   مثل الخناجر في الصدور
وهناك يقتطفونكم   من أرضكم قطف الزهور
الحقد والكذب الصرا   ح وكل مكر أو دهاء
تلك الرذائل في شعو   ب الأرض أبواب الفناء
لولا المخاوف ما سمعنـ   ـا باسمها تحت السماء التي نصنع
لولاه كم تسمع بكفـ   ـر أو نفاق أو رياء
المؤمنون لهم من الـ   ـمولى أمان الأولياء
بلغوا الكمال فهم عن الدّ   نيا العريضة أغنياء

ثقة الكريم بنفسه   تعلو به فوق الزمن
والحزن سم قاتل   لا تشربوا سم الحزن
الموت والحرية الشـ   ـماء والشرف المكين
هي خير ما نعنى به   وهو الغنى للمؤمنين

ہمارے سر پہ پڑتی ہے اور اُن کی نگاہ خنجر کی طرح ہمارے سینہ میں در آتی ہے

ہمارے دل کی تمام برائیاں خوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مکاری کینہ اور جھوٹ خوف کی فضا میں پرورش پاتے ہیں خوف کے دامن میں ریاکاری اور فتنے پلتے ہیں جس کسی نے دین الٰہی کے رمز کو پہچان لیا ہے۔ وہی سمجھتا ہے کہ اصل شرک خوف میں مضمر ہے اس لئے جو شخص شرک سے پاک ہونا چاہتا ہے۔ اُس کو چاہیئے کہ خوف غیر اللہ اور خصوصاً خوف مرگ کو دل سے دور کر دے شان قلندری یہی ہے کہ ہم غم زندگی سے بے نیاز ہو جائیں ورنہ یہ غم ہماری جان کو زہر کی طرح کھا جاتا ہے۔

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر، سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

أما المفضض والمذهب والمفوف والنضيد

فلقد تركناها لعبا د الحطام ولِلعبيد

القلب المحيط بأسرار الطبيعة لا يأخذه هلع، ولا يشك فى أن وراء سكون الجسم محشرا جديدا للخلود، وفى صمت الليل تكمن أحلام لثورة الغد:

فى سكون المساء يختبئ الفجر

وصمت الظلام حلم النهار

وسكون القبور يرقب للبعث

قدوما فى موكب الأقدار

وعلامة المؤمن الحق أن يرضى بحكم الأجل، بل يتسامى إلى اكثر من ذلك فيرى فى لقاء الله سعادة يتبسم لها كما ابتسم إقبال قبل موته بهذه الكلمات:

آية المؤمن أن يلقى الردى

باسم الثغر سرورا ورضا

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

جو دل رمزِ حقیقت سے آگاہ ہے۔ اُس کو موت کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رات کی یہ خاموشی ہنگامہ فردا کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

مردِ حق کی نشانی یہ ہے کہ موت کا ہنسی خوشی استقبال کرے اس کا ثبوت اقبال علیہ الرحمۃ نے خود اپنی مثال سے بھی دیا ہے۔ مرتے وقت اپنا یہ شعر اُن کی زبان پر تھا۔

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

لا أرى مؤمنًا يُخالجه الخو ... نُ إذا أقبل القضاءُ عليهِ
يتلقّى الرّدى بصبرٍ جميلٍ ... وابتسامُ الرّضى على شفتيهِ

كان خالد بن الوليد يعرض عند موته أكثر من مائة وعشرين إصابة، وهو فخور بتلك الجروح، إلا أن فخره هذا كان ينقصه الاستشهاد. فإنّ عظيم النفس لا يموت موت الحشرات في مساربها، والأغنام في حظائرها بل موت الأسود ما نضله عن عرينها وتركان إقبال يرقى أحد الذين ماتوا بعد أن خلّد والأنفسهم ذكرى عاطرة تحت السماء، وكأنّه يصف نفسه حينما قال:

ماتَ ولكن لم يمُتْ ... فهو مخلّدُ الثناءْ
لهُ من الذّكرى حياةٌ ... لا يشوبها الفناءْ
إن شئتَ ناحِ مثلَه ... قبلَ نهايةِ الأجلْ
إنّ الحياةَ في الجهادِ ... والخلودُ للعملْ

توجّهت قافلةٌ من قوافل الحجيج من مكّة إلى المدينة ففاجأها قطّاع الطّريق فاستولى على رجال القافلة الرّعبُ وسقطوا فريسةَ النهب والسّلب

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

یوں تو ہر قسم کی موت سے مرنا ممکن ہے لیکن ایک پختہ کار انسان کے لئے ایسی موت شایانِ شان نہیں، مرنا اس طرح چاہیئے کہ مرنے کے بعد بھی آسمان کے نیچے نام رہ جائے۔

نہ پنداری کہ مردِ امتحاں مرد
کہ میرد گرچہ زیرِ آسماں مرد

ترا شایاں چنیں مرگ است ورنہ   ز ہر مرگے کہ خواہی می تواں مرد

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر ایک قافلہ مدینہ منورہ کی زیارت کو جا رہا تھا کہ وہ راستے میں رہزنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک زائر کے سوا باقی تمام شریکِ قافلہ قتل ہو جاتے ہیں، یہ اس مردِ صادق کے تاثرات

لا فتىً بخاريًّا صمد للموت ولكنه نجا وسار وحيدًا يناجي أشواقه إلى المدينة فكأنّ صداها هذه الأبيات:

هل أتاكم حديثُ قافلةِ الحجا　　جِ إذ غالها عدوٌّ مريدُ
في طريقِ المدينةِ انتهبَ الركـ　　بانَ والمنزلُ المرادُ بعيدُ
يسألُ العابرونَ عن ساحلِ الصّـ　　حراءِ والجوُّ موحشٌ عربيدُ
تتلقّفهمُ المخاوفُ بالمو　　تِ وضلّتْ بهمْ فيافٍ وبيدُ
غيرَ ذاكَ الفتى البخاريِّ لمْ　　يبرحْهُ إيمانُ قلبِهِ الوثّابِ
يتمنّى في الشوقِ سمَّ المنايا　　كتمنّي الظمآنِ بردَ الشرابِ
ملءُ جنبيهِ للمدينةِ شوقٌ　　يتغنّى بنشوةِ التوحيدِ
ويرى الخنجرَ المصوّبَ بالـ　　موتِ إلى صدرِهِ هلالَ العيدِ
كانَ خوفُ الردى يقولُ لهُ ارجعْ　　ويقولُ الإيمانُ سِرْ في أمانْ
ومضى آمنًا وحلَّ كريمًا　　وتلقّتهُ روضةُ الرضوانْ
قد يسيرُ الحجيجُ في المحملِ الشا　　هي في مأمنٍ من الأخطارِ
ولنعيمُ الأشواقِ يعرفُهُ من　　ذاقَ مرَّ الأخطارِ بينَ القفارِ
يخسرُ العقلُ نورَهُ حينَ يأوي　　قانعًا بالهوانِ خوفَ الخسارةْ

آپ بھی سن لیجئے، جو اس حادثے کے باوجود تنِ تنہا یثرب کی طرف چلا جاتا ہے۔

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور
اس بیاباں یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور
ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو، ہو کے بے دل سوئے بیت اللہ پھرے
اس بخاری نوجوان نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی
خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
ہائے یثرب دل میں، لب پر نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بے باکانہ چل
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جاں کاہی میں ہے
آہ! یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے

إنّ في لذّة الفنا غير ربحاً … معنوياً يفوق ربح التجارة

كلّ أمّة عظيمة لم تكتب عظمتها إلّا بالتضحيات والدّماء الغالية. فاسمع إقبالاً يبيّن لنا أن ديباجة الكعبة مخضّبة باللّون الأحمر. فهي قصّة تبدأ بالدم وتنتهي به. بدأت أوّلاً بإسماعيل الّذي أراد أن يضحّي نفسه في مقام التّسليم لله والطّاعة لأبيه. فهي قصّة دامية وإن لم ترق فيها الدّماء، وكذالك ختمت بذكرى الحسين بن علي رض التي جاءت إلى الحرم تقطر دماً من كربلاء:

في الكعبة العليا وقصّتها … نبأ يفيض دماً على الحجر
بدأت بإسماعيل عبرتها … ودم الحسين نهاية العبر

إنّ إرواء شجرة القومية لا يكون من ماء البحر بل من دماء صدور الأبطال، وشرف الملّة يتلألأ في ذالك الجام الذي امتلأ بدم الشهداء:

ارفعوا الورد والشقائق إلخ

اور تاثر آدمی کا کس قدر بے باک ہے

کوئی قوم اُس وقت تک زندہ نہیں رہتی اور معرکۂ حیات میں نہیں پنپ سکتی جب تک کم از کم اُس کے ممتاز ترین افراد میں جاں نثاری اور سرفروشی کا جذبہ اِس حد تک نہ ہو کہ وہ قوم کی خاطر ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لئے تیار ہو جائیں، اقبال کے نزدیک ساری داستانِ حرم صرف اس قدر ہے کہ اس کا دیباچہ تذکرۂ اسماعیل ہے جو خدا کی بارگاہ میں اور اُس کے حکم پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے، اور اس کا خاتمہ ذکرِ حسینؑ ہے جنہوں نے حق و صداقت کے لئے اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اُس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

قوم کے پودے کی آبیاری دریا کے پانی سے نہیں بلکہ اُس خون سے ہوتی ہے جو شہیدوں کے سینہ سے نکلتا ہے۔ ملت کی آبرو اُس پیالے میں جھلکتی ہے جس میں خونِ شہید بھرا ہوا ہو، یہ خون قدر و قیمت میں حرم سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ شہیدوں کی تربت پر لالہ کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

ليل شتاء على ضريح الشهيد
ذاك لون الدم الذى أنبت المجـ
ـد وروّى به حياة الخلود

كانت إحدى بنات العرب واسمها فاطمة تسقى الغزاة ماء فى حرب طرابلس، ثم استشهدت فهو يلقب هذه المجاهدة بلا سيف وترس "شرف أمة الإسلام" وكانت عينه تسكب دموع الشعر فى هذه الحادثة، ولكن ما تبهما الحزن كان يبعث أيضا سحر النشيد. فى البستان الذى أذبلت عواصف الخريف أغصانه عادت إحدى البراعم الساقطة فنمت و فتحت الزهر الجميل بعد أن ظن أنها جفت وماتت

فى ثنايا الوديان تختبئ النغمة
لأن خلف السحاب مختفيات
والبروق اللوامع استترت
خلف ضباب السحاب الممطرات

بہ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

عرب کی ایک لڑکی فاطمہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ تو اس بے تیغ و سپر جہاد کرنے والی کو وہ آبروئے اُمتِ مرحومہ کا لقب دیتے ہیں۔ اگرچہ فاطمہ کے غم میں اُن کی آنکھ آنسو بہا رہی ہے۔ لیکن اُن کے نالۂ ماتم میں نغمۂ عشرت بھی موجود ہے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں۔ کہ جس باغ کو خزاں نے اُجاڑ دیا تھا، اور جس کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس میں اب کوئی پھول کھل نہیں سکتا اس میں ایسی چنگاریاں بھی باقی ہیں، جن بادلوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا۔ کہ وہ مدت ہوئی برس چکے اُن میں ابھی بجلیاں سو رہی ہیں:ـ

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں،
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

وبعد أن كشف في جملة أشعاره تلك الحقائق الجليلة بيّن أيضاً أسرار الموت والحياة في كتابه "جاويد نامه" على لسان الملك المستعبد "تيبو" الذي يسمع قصته نهر كاويرى حيث يوضح أن الحياة أصل الحقيقة وأن الموت خدعة عارضة. وأن الحياة محرّمة على الأذلاء الذين استعبدهم خوف الموت.

إنّ الجبان يموت في أوهامه
حذرَ المماتِ وخوفُه يفنيه
والحرُّ تسعده المواطنُ كلُّها
بالعيشِ حتى موتُه يحييه
وأرى المنايا كالحياة تفاوتت
في سوقها الأقدارُ والأرواحُ
لا يستوى قتلُ الحسينِ وغيره
هل يستوي المصباحُ والإصباحُ
ليس الموت إلا اسماً لحياة الذلة، وفقدا لروس

اِن مختلف طریقوں سے موت کے راز کو فاش کرنے کے بعد زندگی اور موت کی حقیقت "جاوید نامہ" میں سلطان شہید ٹیپو کی زبانی دریائے "کاویری" کو سنائی ہے۔ زندگی اصل حقیقت ہے۔ موت ایک فریب اور دھوکا ہے غلام کی موت کے خوف سے زندگی حرام ہو جاتی ہے لیکن بندۂ آزاد کے لئے موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ موت سے اُس کو نئی زندگی ملتی ہے۔ اگرچہ ہر موت مؤمن کے لئے خوش آئند ہے لیکن حسین ابن علیؑ کی موت کچھ اور ہی شان رکھتی ہے۔

هر زمان میرد غلام از بیمِ مرگ
زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانے دِگر
مرگ او را می دہد جانے دگر
گرچہ هر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضٰیؑ چیزے دِگر

(کس ندانہ جز شہیدے این نکتہ را   کو بخون خود خرید این نکتہ را)

غرض موت صرف بے غیرتی کی زندگی کا نام ہے، عزت اور آبرو

فى النضال مع الشرف لايقل قيمة عن البقاء الدائم
فلحظة من عمر الأسد خير من حياة الشاة مائة عام

العمر لايقاس بالأعوام   والعقل لايقاس بالأجسام
واليوم من عمر أسود الآجم   بألف عام من حياة الغنم

الخضر قد قال له الإسكندر
مقالة على الزمان تؤثر

عش ساعة فى لجج البحار   ومت شهيد الموج والتيار
ولا تعش دهرا كعيش خامل   مقيد بين صخور الساحل

الموت فى الوغى وفى الميدان   ولا حياة الأسر والهوان

ليست قيمة الحياة بقصرها أو بطولها، ولكن قيمتها فى أعمالها، ولذتها فى جهادها، فالفراش يبذل الحياة رخيصة فى لذة لمحة ليطوف بما حول السراج حتى يفنى فى ناره المتوجة هجة:

رأيت الفراشة حول السراج   تحوم على ناره بالجناح
وحاولت إنقاذها فانثنت   تعاتبنى فى مقال صراح

کی زندگی میں عمر کھونا ہی بقائے دوام سے کم نہیں۔ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ بکری کی عمر کے سو سال سے زیادہ ہے۔ سمندر کی موجوں سے ایک گھڑی مقابلہ کرنا اور اس مقابلے میں فنا ہو جانا ہزار برس ساحل پر آرام کی زندگی سے خوشتر ہے

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دم شیرے بہ از صد سالہ میش

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

زندگی چاہے مختصر ہو لیکن کام کی ہو۔ خضر کو اپنی عمر دراز میں زندگی کی کوئی لذت حاصل نہیں، لیکن پروانہ کو ایک پل بھر شمع کے گرد طواف کرنے میں حقیقی سرور نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ ہماری دنیوی زندگی صرف ایک دو لمحہ رہے گی لیکن ہمیں تب و تاب جاودانہ حاصل ہوگا کام زیادہ اور وقت تھوڑا ہے۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت　　دمے از زندگی تاب و تبم بخش

هبوني من دهركم لحظةً أموج بها في اللهيب اضطرابا
أنال بها شرفا في الجهاد وأصبح من بعد هذا ترابا

أحب احتراقي بنار اشتياقي ولا أرتضي عيشة الخاملين
فناء الفراشة في النار يعلو حياة الجبان طوال السنين

الأعمال كثيرة والأوقات قصيرة، لا يهمنا أن نعيش طويلا، ولكن يهمنا أن نعمل عملا جليلا. إن الأحياء الحقيقيين هم الذين جاهدوا، وهم الذين صوّر لنا جهادهم "إقبال"، وضرب لنا منهم الأمثال. ووقف "إقبال" على قبر نابليون وقفة المستعبر مفكرا يقول: إن هذا وإن نام في راحة الأبد ولكن لا يزال، أمام أعيننا ذلك الوقت الذي زلزل فيه العالم، ثم يكشف أسرار الموت والحياة وهو نائم على ذلك القبر، ويترك لنا رسالة الحياة والعمل ليقول لنا إن الدنيا لحظة أو لحظتان، وبعدها نوم القبر الطويل في منازل الصامتين، فارم سهمك إلى قبة

پریشاں کن سحر خاکستر م را
ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

شرر پریدہ رنگم مگذر ز جلوۂ من
کہ بہ تابِ یک دو آنے تپ جاودانہ دارم

کام بھاری اور وقت تنگ پا ہے، ہماری زندگی پابہ رکاب ہے، فرصت عمل دم بھر سے زیادہ نہیں۔ اس لئے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا چاہیئے۔

نپولین کے مزار پر کھڑے ہوئے اقبال سوچتے ہیں کہ اگرچہ آج یہ آرام سے سو رہا ہے لیکن ایک وقت وہ تھا کہ اس نے دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس مزار پر کھڑے ہوئے وہ موت کا راز کھول کر بیان کرتے ہیں اور ہمارے لئے زندگی اور عمل کا پیغام چھوڑ جاتے ہیں۔

الفلك :-

إذا كانت الأقدار سرًّا محجّبًا | فإنّ جهاد الحرّ يجلو لنا القدر
جهاد الفتى يعلو به فوق قدره | وفوق الأماني والمواهب والفكر
لقد بلغ الإسكندر القمّة التي | يقصّر عن أدنى مواقعها الصقر
رأى جبل الأوند أسياف جيشه | فأذعن حتّى ذاب من رعبه الصخر
وتيمور بين الفاتحين مضت له | وقائع لم يسمع بهنّ زمان
يمزّق مثل السهل الوعر جيشه | كما انساب في شلّاله فيضان
بنور الجهاد الحيّ سار محمّد | بجيش على راياته الفوز إكليل
أرى فرصة الأعمال ومضة بارق | يضيء سناها لمحةً ويزول
إلى الفوز جاهد ما استطعت ولا تنم | ففي القبر نوم بعد ذاك طويل
منازل وادي الصامتين على البلى | ستبقى بها حتّى النشور مقيما

إذا العزم نادى فارم سهمك صاعدًا
على قبّة الأفلاك وامض عظيما

(انتهى)

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشان است
حالیا! غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

(ختم شد)

الكتاب الثاني

کتاب ثانی

النشيد الإسلامي

الصين لنا والعرب لنا ... والهند لنا والكل لنا

أضحى الإسلام لنا دينا ... وجميع الكون لنا وطنا

توحيد الله لنا نور ... أعددنا الروح له سكنا

الكون يزول ولا تمحى ... في الدهر صحائف سؤددنا

بنيت في الأرض معابدها ... والبيت الأول كعبتنا

هو أول بيت نحفظه ... بحياة الروح ويحفظنا

في ظل السيف تربينا ... وبنينا العز لدولتنا

علم الإسلام على الأيام ... شعار المجد لملتنا

بهلال النصر يضيء لنا ... ويمثل خنجر سطوتنا

وأذان المسلم كان له ... في الغرب صدى من همتنا

قولوا السماء الكون لقد ... طاولنا النجم برفعتنا

ترانۂ ملی

اس کے عربی ترجمہ کو عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی نے سنہ ۱۹۳۶ء میں اپنا خصوصی ترانہ منتخب کیا ہے

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

يا دهر لقد جربت على نيران الشدة عزمتنا
طوفان الباطل لم يغرق في الخوف سفينة قوتنا
يا ظل حدائق أندلس أنسيت مغاني عشرتنا
وعلى أغصانك أوكار عمرت بطلائع نشأتنا
يا دجلة هل سجلت على شطيك مآثر عزتنا
أمواجك تروي للدنيا وتعيد جواهر سيرتنا
يا أرض النور من الحرمين ويا ميلاد شريعتنا
روض الإسلام ودوحته في أرضك رواها دمنا
ومحمد كان أمير الركب يقود الفوز لنصرتنا
إن اسم محمد الهادي روح الآمال لنهضتنا
دوت أنشودة إقبال جرسا أيقظ فيه الزمنا

ليعيد قوافلنا الأولى
في المجد ويبعث أمتنا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو؟
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہیں
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

نوٹ: اس ترانے کا دمشق ریڈیو نے بے مثال ریکارڈ تیار کیا ہے۔

وطنیت و فرقہ واریت و تعلیم

محدود وطنیت اور فرقہ واریت اور صرف دنیاوی تعلیم مسلمانانِ عالم کے لئے انتہائی خطرناک ہے اسی لئے علامہ اقبال اس کے خلاف جہاد کرتے رہے ہیں ذیل کے اشعار پر غور فرمائیں:

۱۔ اے کہ شناسی خفی را از جلی ہوشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہوشیار باش

۲۔ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

۳۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

۴۔ وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کفِ جو

حَدِيثُ الرُّوح

أشعار منتخبة من قصيدتي اقبال شكوى وجواب شكوى التي غنتها كوكب الشرق السيدة أم كلثوم المصرية

(٤ مايو ١٩٦٧ في القاهرة)

حَدِيثُ الرُّوح

۴ مئی ۱۹۶۷ء کو مطربۂ شرق سیدہ اُمّ کلثوم نے شکوہ، جواب شکوہ کے ۲۸ منتخب اشعار کو ایک جشنِ موسیقی میں گا کر اور دس ہزار ریکارڈ بنوا کر پاکستان کی ممتاز خدمت کی ہے۔

یہاں عربی اشعار اور اُن کے بالمقابل اُردو اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

حديث الروح

حديث الروح للأرواح يسري — وتدركه القلوب بلا عناء
هتفت به فطار بلا جناح — وشق أنينه صدر الفضاء
ومعدنه ترابي ولكن
جرت في لفظه لغة السماء
لقد فاضت دموع العشق مني — حديثا كان علوي النداء
فحلق في ربى الأفلاك حتى — أهاج العالم الأعلى بكائي
تحاورت النجوم وقلن صوت
بقرب العرش موصول الدعاء
وجاوبت المجرة علّ طيفا — سرى بين الكواكب في خفاء
وقال البدر هذا قلب شاك — يواصل شدوه عند المساء
ولم يعرف سوى رضوان صوتي
وما أحراه عندي بالوفاء

حدیث الروح

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا
پیرِ گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے ستارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

شكواي أم نجواي في هذا الدجى ... ونجوم ليلي حسدي أم عودي
أمسيت في الماضي أعيش كأنما ... قطع الزمان طريق أمسي عن غدي
والطير صادحة على أفنانها ... تبكي الربى بأنينها المتجدد
قد طال تسهيدي وطال نشيدها ... ومدامعي كالطل في الغصن الندي
فإلى متى صمتي كأني زهرة
خرساء لم ترزق براعة منشد
قيثارتي ملئت بأنات الجوى ... لابد للمكبوت من فيضان
صعدت إلى شفتي خواطر مهجتي ... ليبين عنها منطقي ولساني
أنا ما تعديت القناعة والرضا
لكنما هي قصة الأشجان
يشكو لك اللهم قلب لم يعش
إلا لحمد علاك في الأكوان
من كان يهتف باسم ذاتك قبلنا ... من كان يدعو الواحد القهارا
عبدوا الكواكب والنجوم جهالة ... لم يبلغوا من هديها أنوارا
هل أعلن التوحيد داع قبلنا

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

وَهَدَى القُلُوبَ اِلَيكَ وَالأَنظَارَا
نَدعُو جِهَارًا لَا اِلٰهَ سِوَى الَّذِى
صَنَعَ الوُجُودَ وَقَدَّرَ الأَقدَارَا
اِذَا الاِيمَانُ ضَاعَ فَلَا أَمَانُ
وَلَا دُنيَا لِمَن لَم يُحْيِ دِينًا
وَمَن رَضِيَ الحَيَاةَ بِغَيرِ دِينٍ
فَقَد جَعَلَ الفَنَاءَ لَهَا قَرِينًا
وَفِى التَّوحِيدِ لِلهِمَمِ اتِّحَادٌ
وَلَن تَبنُوا العُلَا مُتَفَرِّقِينَا
أَلَم يُبعَث لِأُمَّتِكُم نَبِيٌّ
يُوَحِّدُكُم عَلَى نَهجِ الوِئَامِ
وَمُصحَفُكُم وَقِبلَتُكُم جَمِيعًا
مَنَارٌ لِلأُخُوَّةِ وَالسَّلَامِ
وَفَوقَ الكُلِّ رَحمٰنٌ رَحِيمٌ
اِلٰهٌ وَاحِدٌ رَبُّ الأَنَامِ

مانتے پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے

اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے

نہ یہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو

بزمِ توحید بھی، دُنیا بھی نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کرلو

ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کرلو

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک

ایک ہی سب کا رب، نبی، دیں بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک

کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

شکوہ و جوابِ شکوہ

عربی زبان کے انداز اور عربی ماحول و ذہنیت کا خیال کر کے تراجم اقبالؔ ۱۹۴۷ء سے ہم نے شائع کرنا شروع کیا۔ اسی لئے کہیں کہیں اُردو کے دو بندوں کا مفہوم عربی کے ایک بند ہی میں سمو دیا گیا ہے۔ اور بعض جگہ ادائیگی کا انداز بدل دیا گیا ہے مثلاً شکوہ کے اس شعر؛

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور	اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

کا مفہوم ان دو شعروں سے ادا کیا گیا ہے:

أَنَا مَا حَسَدْتُ الْكَافِرِينَ وَقَدْ غَدَوْا	فِي أَنْعُمٍ وَمَوَاكِبٍ وَقُصُورِ
بَلْ مِحْنَتِي أَلَّا أَرَى فِي أُمَّتِي	عَمَلًا تُقَدِّمُهُ صَدَاقَ الْحُورِ

۱۹۶۷ء تک اقبالؔ کے چھ مترجموں کے عربی تراجم کو مطربۂ مشرق سیدہ ام کلثوم اور اُنکے مشیروں نے بغور مطالعہ کر کے ہمارے ترجمۂ شکوہ و جوابِ شکوہ کے ۲۸ اشعار کو ہی منتخب کیا جسے "حدیث الروح" کے نام سے ۷ مئی ۱۹۶۷ء کو خاص جشن موسیقی میں گا کر دس ہزار رکارڈ بنوا کر عام کیا ہے۔ مطربۂ مشرق کا ارادہ ہے کہ جلد قصیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو گائیں گی۔

مقدمة

شكوى وجواب شكوى

قصيدتان تُعدّان في طليعة ما نظم إقبال في اللغة
الأردية حاول بهما أن يستحث همم المسلمين إلى طلب
الرفعة والطموح إلى المجد واستخلاص تراث الماضي من
بين براثن الدهر والعودة بالركب الإسلامي إلى قافلة الحياة
الدائبة في سيرها صوب الكمال. أما أولاهما فقد اتجه بها
إلى الله تعالى شاكيًا ما أصاب المسلمين من الأحداث والغير
التي تخلفت بهم عن ركب الحضارة وهم الذين حملوا شعلتها
ورفعوا مصابيحها بعصور الدهر وأجياله. نراه في مطلع شكوى
يصور أشجانه وآلامه ثم يوجه العتب المرير إلى نفسه

وَاستسلامها المحن ويقول لماذا أبكي بفناء الزهرة الخرساء
وَلا أحلق كالطير المغرد...... ثم يستأذن على عتبات المقام
الإلهي وفي فمه التراب ليعلن صرخة المسلمين ويحيا بدعوا
تهم ولم لا وتبشارته مملوءة بالأنين والأشجان تريد أن
تنطق على شفتيه بأنفاسه المتصاعدة۔

رباه إليك شكوى عبيدك الأوفياء الذين لم يتعودوا
إلا إزجاء الحمد وترتيل الثناء، لقد كانت الدنيا قبل
هذا الدين الاسلامي عالما من الظلام تسوده الوثنية وتحكمه
الأصنام، وفي بقاع هذا المعمور كانت سجدات الانسان
لا تعرف غير الاوثان، ولم يكن الإنسان يعبد غير التماثيل
المنحوتة من الاحجار والصور المصنوعة من الأشجار، وحارت
فلسفة اليونان وتشريع الرومان وضلت حكمة الصين
في الفلوات. ولكن ساعد المسلم القوى اقتلع من
الأرض شجرة الإلحاد وأطلع على الإنسانية نوراً من التوحيد
وظلا من الاتحاد رباه!

لقد كانت بساتين هذا الكون بغير أنغام وأزهارها خالية من العطر وكان هواؤها دوي العاصفة ونسيمها دمدمة الرعود حتى إذا جاء رسول مكة الأمي علم أهل الأرض حياة أهل السماء ودل سكان عالم الفناء على طريق عالم البقاء۔

نحن الذين نشرنا في الروض العبير ومحونا آية الليل بآية الصبح المنير أصبح إيماننا جنون عشق فوجهنا الإنسانية بنورك في مثل كرة الطرف إلى معرفة الحق والنور والجمال لقد كانت الدنيا عامرة بشعوب وممالك وكان بها السلجوقي والتوراني والصيني وكان بها ملك ساسان وبقايا الرومان واليونان فنحن علمنا التوحيد وجمعنا أبناء البشر وأجياله أسرة مؤمنة بك موحدة لك أصلحنا الفاسد وقومنا المعوج وناضلنا في البر والبحر وارتفع صوتنا بالأذان فوق معابد أوربا وارتسمت سجداتنا على رمال الصحراء في أفريقيا لم نخش عسف الأكاسرة

ولا طغيان الجبابرة ولا سلطان الأباطرة وأسمعنا العالم كله كلمة التوحيد. وصليل السيوف المشرعات كان يدوى مع الهاتفين لا إله إلا الله وحده لا شريك له الملك القدوس العزيز الحكيم لم نكن نحرص على الحياة ولكن كنا نجاهد من أجل دينك ليحيا الى الأبد فى تفانينا وما بعنا الأرواح لدنيا نشتريها بل كنا نطوف حول الكرة ورؤوسنا على أكفنا لنجعل اسمك الأعلى منارا ونحن نحطم فى تطوافنا الهيا كل والأصنام جاعلين وضنها ونضارها ترابا تحت الأقدام.... ولو أن أقدام الأسود تزلزلت من هول الميادين فلقد كانت أقدامنا على الشوك والنار لا تأذن لشمس النهار أن تغرب حتى يضئ لنا هلال الانتصار. لقد نقشنا توحيدك على كل قلب والايمان بك فى كل ضمير نرحب بالحتوف ونرى الجنة تحت ظلال السيوف. من الذى جعل درعه يوم الجهاد باب خيبر؟ ومن الذى حمل مصباح الحق

إلى مدينة قيصر؟ من قبلنا هدم التماثيل وقوض صرح الأباطيل ..... من الذى زجيوش الكفار أبطل فى الفرس عبادة النار؟.....

أما أيقظنا الكون الهاجع بصوت الأذان ......
ألم نقم الصلاة تحت الأسنة فى الميدان، حتى سجدت لك على الأرض الأوثان، وسمع تكبيرنا فى الجنة رضوان.

لقد كانت وجوهنا إلى الكعبة، وعزائمنا إلى الميدان وقلوبنا إليك، وصلى بين يديك السوقة والأمير والغنى والفقير ووقف محمود الغزنوى الملك وعبده إياز، وجسماهما فى الهند وقلباهما إلى الحجاز، كنا ندور بكأس الإيمان فى محفل الكون والمكان، لم نقف عند الصحارى والقفار بل امتطينا النجائب من أمواج البحار حتى استضاءت النيرات بوجوه مجاهدينا فى بحر الظلمات ومحونا الباطل من كتاب

الدهر وحررنا المستعبدين وملأنا بجباهنا بيتك المعمور
وجعلنا لآياتك مصحفا في الصدور......

إني لأرى في شعوب المدنية الزائفة من يجترئون
على الخطايا ويقتحمون حرم الفضائل والآداب وفيهم
سكارى الخمر وسكارى الإلحاد، ولكن الدنيا ترسل عليهم
السحب أمطارا وتمطر أرضنا صواعق ونارا نظرت
إلى الأوثان والطواغيت فإذا هي راقصة في ملاعب
الأهواء إنها ساخرة منا وما أمرنا سخرية الأعداء
أقول إن المؤمنين قد انتثروا وكاد المخلصون أن يندثروا
ولم تعد الصحراء ترى حداة القوافل ولا المتعبدين
في المنازل. ونحن لا نشكو أن فاضت خزائن الكفار بالنضار
ولكن الشكوى أن يصيبنا الفقر والقصور حتى لا نجد للجنة
صداق الحور ولا ثمن القصور......

يارب رحماك هب لنا ما عودتنا فضلك من نصر وتأييد
فقد دارت بنا الكواكب في أفلاكها دورة العكس......

إن قدرتك هى قدرتك وما لفضلك حد ولا لنعمائك عد لو شئت أجريت البحر فى الصحراء أو رفعت الجبال من الماء لم يبق لنا يارب من ثروة سوى الفقر ولا من قوة سوى العجز إن ذهاب المسلمين من الدنيا هو ذهاب الدنيا بأسرها وما نطلب البقاء فيها لحظة إلا للفناء فى حبك يا أرحم الراحمين. لقد ذهب الأغيار بما كان فى أيدينا ولبقيت قلوبنا عامرة بك وما بقاء الدين إلا ببقاء أهله والجام بما فيه لا يبقى بغير ساقيه ربّاه أين محافل العشاق؟ أين الذين توضؤوا للصباح بمدامع الأشواق؟ أين الذين اقتبست الشمس من وجوههم الإشراق؟

لقد مضى زجل المسبحين وخفت أنين المستغفرين وخلا ضمير الليل من دعوات المتبتلين وبكاء المصلين وهبوك قلوبهم يارب وفازوا بأجر العاملين وأصبحت الأرض بعدهم خالية والديار خاوية فكأنهم ما

سلموا حين قدموا وكأنهم ما أقاموا بعد أن سلموا.
من لي بنور محمد ليكون مصباحي حين ألقت عن
حفلهم الذاهب ولنورهم الغارب... لا لا إني لن أصغي
إلى أنات قلبي المحزون فما زال من الدنيا ساحر ليلى ولاغرام
قيس وما برحت صحراء نجد مرتعا لمها والغزال ومبعثا
للهوى والدلال ولن يزول جمالها حتى تزول الجبال.
إن جمال أمة محمد لا يزال يجتذب قلوب الكون بإشراقه
الساطع فأنقذنا من ظلمة هذا اليأس المميت، ما زال في
قلوبنا وفاء الصديق وعدل الفاروق وفي كل قلب للقرآن
مصحف عثمان ولا زالت قلوبنا عامرة بتقوى علي وسلمان
وصوت بلال في الأذان لم نفقد الإيمان القويم ولا قياس
طرق السليم، أيقظنا يارب بصلصلة الجرس الأول وأحينا
بف لون الوفاء. لقد أكملت الدين على قمة فاران وأنرت
قلوب العاشقين بجذوة الإيمان فأحرق متاع حب دنيانا
بذالك الشرر من وميض محبتك، لقد طرب أعداؤنا بين

الجداول وسكروا بالأنغام فى ظل الخمائل وهم فى الأوطان ونحن خارج البستان فأرسل فواشك مرة أخرى يطف حول نار حبك ومر البرق القديم بإحراق القلوب الجامدة رب اهد القلوب إلى قبلة الحجاز وأعطها جناحا من الايمان لتعرف قوة الطيران ..... ان العبير حائر بين البراعم الأزهار والأنغام محتبسة فى الأوتار والطور فى شوق إلى تجلى أنوارك واقتبال أسرارك

ربنا وانت الحكيم القادر احلل عقدة من لسانى يفقهوا قولى أبهم النملة الضعيفة حكمة الايمان حتى تقع يدها على ملك سليمان وافتح العيون على ضياء الحق للعالمين حتى نرى براهمة الهند مسلمين إن عطر الازهار قد باح بسر البستان ونمت الصرخات عما فى الوجدان ....

أعد الطيور المغردة إلى أغصان الصنوبر فقد فرت من روضها الابلبلا يحمل فى قلبه تحية القيامة وحول المحشر أعد الاوراق الزابلة الى روضها الأخضر وجذ فى المسلمين ظمأهم إلى حياض

الكوثر يا رب إني بلبل تحررت من موسم نيسان لأرسل أنغامي
طليقة بالشكوى في مسمع الزمان فاجعل ندائي قبسا من
من وحي الإيمان أن خمري حجازية وإن كنت أعجمي
الدنان ونغمي من الهند ولكن صوتي من عدنان...

شكوى

شكواي أم نجواي في هذا الدجى   ونجوم ليلي حسّدي أم عوّدي

أمسيت في الماضي أعيش كأنما   قطع الزمان طريق أمسي عن غدي

والطير صادحة على أفنانها   تبكي الربى بأنينها المتجدد

قد طال تسهيدي وطال نشيدها   ومدامعي كالطل في الغصن الندي

فإلى متى صمتي كأني زهرة   خرساء لم ترزق براعة منشد

قيثارتي ملئت بأنات الجوى   لا بد للمكبوت من فيضان

صعدت إلى شفتي بلابل مهجتي   ليبين عنها منطقي ولساني

أنا ما تعديت القناعة والرضا   لكنما هي قصة الأشجان

أشكو وفي فمي التراب وإنما   أشكو مصاب الدين للديان

يشكو لك اللهم قلب لم يعش   إلا لحمد علاك في الأكوان

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں   فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہمنوا! میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم   قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم   نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

قَدْ كَانَ هٰذَا الكَوْنُ قَبْلَ وُجُودِنَا ... رَوْضًا وَأَزْهَارًا بِغَيْرِ شَمِيمِ
وَالوَرْدُ فِي الأَكْمَامِ مَجْهُولُ الشَّذَى ... لَا يُرْتَجَى وَرْدٌ بِغَيْرِ نَسِيمِ
بَلْ كَانَتِ الأَيَّامُ قَبْلَ وُجُودِنَا ... لَيْلًا لِظَالِمِهَا وَلِلْمَظْلُومِ
لَمَّا أَطَلَّ مُحَمَّدٌ زَكَتِ الرُّبَى ... وَاخْضَرَّ فِي البُسْتَانِ كُلُّ هَشِيمِ
وَأَذَاعَتِ الفِرْدَوْسُ مَكْنُونَ الشَّذَى ... فَإِذَا الوَرَى فِي نَضْرَةٍ وَنَعِيمِ

مَنْ قَامَ يَهْتِفُ بِاسْمِ ذَاتِكَ قَبْلَنَا ... مَنْ كَانَ يَدْعُو الوَاحِدَ القَهَّارَا
عَبَدُوا تَمَاثِيلَ الصُّخُورِ وَقَدَّسُوا ... مِنْ دُونِكَ الأَحْجَارَ وَالأَشْجَارَا
عَبَدُوا الكَوَاكِبَ وَالنُّجُومَ جَهَالَةً ... لَمْ يَبْلُغُوا مِنْ هَدْيِهَا أَنْوَارَا
هَلْ أَعْلَنَ التَّوْحِيدَ دَاعٍ قَبْلَنَا ... وَهَدَى الشُّعُوبَ إِلَيْكَ وَالأَنْظَارَا
كُنَّا نُقَدِّمُ لِلسُّيُوفِ صُدُورَنَا ... لَمْ نَخْشَ يَوْمًا غَاشِمًا جَبَّارَا

قَدْ كَانَ فِي اليُونَانِ فَلْسَفَةٌ وَفِي الـ ... ـرُّومَانِ مَدْرَسَةٌ وَكَانَ المُلْكُ فِي سَاسَانِ
لَمْ تُغْنِ عَنْهُمْ قُوَّةٌ أَوْ ثَرْوَةٌ ... فِي المَالِ أَوْ فِي العِلْمِ وَالعِرْفَانِ
وَبِكُلِّ أَرْضٍ سَامِرِيٌّ مَاكِرٌ ... يَكْفِي اليَهُودَ مَئُونَةَ الشَّيْطَانِ
وَالحِكْمَةُ الأُولَى جَرَتْ وَثَنِيَّةً ... فِي الصِّينِ أَوْ فِي الهِنْدِ أَوْ تُورَانِ
نَحْنُ الَّذِينَ بِنُورِ وَحْيِكَ أَوْضَحُوا ... نَهْجَ الهُدَى وَمَعَالِمَ الإِيمَانِ

تھی تو موجود ازل سے تری ذاتِ قدیم　　پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم　　بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر　　کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر　　مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی　　اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی　　اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

من ذا الذي رفع السيوف ليرفع   اسمك فوق هامات النجوم منارا

كنا جبالا في الجبال وربما   سرنا على موج البحار بحارا

بمعابد الإفرنج كان أذاننا   قبل الكتائب يفتح الأمصارا

لم تنس إفريقيا ولا صحراؤها   سجداتنا والأرض تقذف نارا

وكأن ظل السيف ظل حديقة   خضراء تنبت حولنا الأزهارا

لم نخش طاغوتا يحاربنا ولو   نصب المنايا حولنا أسوارا

ندعو جهارا لا إله سوى الذي   صنع الوجود وقدر الأقدارا

ورؤوسنا يا رب فوق أكفنا   نرجو ثوابك مغنما وجوارا

كنا نرى الأصنام من ذهب   فنهدمها ونهدم فوقها الكفارا

لو كان غير المسلمين لحازها   كنزا وصاغ الحلي والدينارا

كم زلزل الصخر الأشم فما وهى   من بأسنا عزم ولا إيمان

لو أن آساد العرين تفزعت   لم يلق غير ثباتنا الميدان

وكأن نيران المدافع في صدو   ر المؤمنين الروح والريحان

توحيدك الأعلى جعلنا نقشه   نورا تضيء بصبحه الأزمان

فغدت صدور المؤمنين مصاحفا   في الكون مسطورا بها القرآن

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں، خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کیلئے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

مَن غيرُنا هدمَ التماثيلَ التي ... كانت تقدِّسُها جهالاتُ الورى

حتى هوَتْ صورُ المعابدِ سُجَّدًا ... لجلالِ مَن خلقَ الوجودَ وصوَّرا

ومِنَ الأُلى حملوا بعزمِ أكفِّهم ... بابَ المدينةِ يومَ غزوةِ خيبرا؟

أمَّنْ رمى نارَ المجوسِ فأُطفئتْ ... وأبانَ وجهَ الحقِّ أبلجَ نيِّرا؟

ومَنِ الذي بذلَ الحياةَ رخيصةً ... ورأى رضاكَ أعزَّ شيءٍ فاشترى

نحنُ الذينَ استيقظتْ بأذانِهم ... دنيا الخليقةِ من تهاويلِ الكرى

نحنُ الذينَ إذا دُعُوا لصلاتِهم ... والحربُ تسقي الأرضَ جامًا أحمرا

جعلوا الوجوهَ إلى الحجازِ وكبَّروا ... في مسمعِ الروحِ الأمينِ فكبَّرا

محمودُ مثلُ إيازَ(١) قامَ كلاهُما ... لكَ بالخشوعِ مصلِّيًا مستغفرا

العبدُ والمولى على قدمِ التقى ... سجدا لوجهكَ خاشعينِ على الثرى

بلغتْ نهايةَ كلِّ أرضٍ خيلُنا ... وكأنَّ أبحرَها رمالُ البيدِ

في محفلِ الأكوانِ كانَ هلالُنا ... بالنصرِ أوضحَ من هلالِ العيدِ

في كلِّ موقعةٍ رفعنا رايةً ... للمجدِ تُعلنُ آيةَ التوحيدِ

أممُ البرايا لم تكنْ مِن قبلِنا ... إلّا عُبيدًا في إسارِ عبيدِ

بلغتْ بنا الأجيالُ حُرِّيّاتِها ... مِن بعدِ أصفادٍ وذلِّ قيودِ

(١) السلطان محمود الغزنوى واياز خادمه المعروف

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟ اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی؟ کس کی تکبیر سے دُنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟ منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

خالقُ ربِّ هل بغيرِنا هنا ... عُرِفَ السجودُ لبيتِكَ المعمورِ

كانت شعابُ قلوبِنا لكَ مصحفًا ... يحوي جلالَ كتابِكَ المسطورِ

إن لم يكن هذا وفاءً صادقًا ... فالخلقُ في الدنيا بغيرِ شعورِ

ملأ الشعوبَ جناتُها وعصاتُها ... من ملحداتٍ ومن مغرورِ

فإذا السحابُ جرى سقاهم غيثُه ... واختصّنا بصواعقِ التدميرِ

قد هبّتِ الأصنامُ من بعدِ البلى ... واستيقظت من قبلِ نفخِ الصورِ

والكعبةُ العليا تُواري أهلَها ... فكأنّهم موتى لغيرِ نشورِ

وقوافلُ الصحراءِ ضلّ حُداتُها ... وغدت منازلُها طلالَ قبورِ

أنا ما حسدتُ الكافرين وقد غدوا ... في أنعُمٍ ومواكبٍ وقصورِ

بل محنتي ألّا أرى في أمتي ... عملًا تقدّمُه صداقَ الحورِ

لكَ في البريّةِ حكمةٌ ومشيئةٌ ... أعيت مذاهبُها أولي الألبابِ

إن شئتَ أجريتَ الصحارى أنهرًا ... أو شئتَ فالأنهارُ موجُ سرابِ

ماذا دهى الإسلامَ في أبنائه ... حتى انطووا في محنةٍ وعذابِ

فتراهمُ فقرٌ ودولةُ مجدِهم ... في الأرضِ نهبُ ثعالبٍ وذئابِ

عاقبتنا عدلًا فهب لعدوّنا ... عن ذنبِه في الدهرِ يومَ عقابِ

اُمتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
اِن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پہ
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حُدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنیکا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دُنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

عاشوا بتربتنا وعشنا دونهم   بالموت بين الذل والإملاق
الدين يحيا في سعادة أهله   والكأس لا يبقى بغير الساقي
أين الذين بنار حبك أرسلوا   الأنوار بين محافل العشاق
سكبوا الليالي في أنين دموعهم   وتوضؤوا بمدامع الأشواق
والشمس كانت من ضياء وجوههم   تهدي الصباح طلائع الإشراق

كيف انطوت أيامهم وهم الألى   نشروا الهدى وعلوا مكان الفرقد
هجروا الديار فأين أزمع ركبهم   من يهتدي للقوم أو من يهتدي
يا قلب حسبك لن تلم بطيفهم   إلا على مصباح وجه محمد
فازوا من الدنيا بمجد خالد   ولهم خلود الفوز يوم الموعد
يا رب ألهمنا الرشاد فما لنا   في الكون غيرك من ولي مرشد

ما زال قيس والغرام كعهده   وربوع ليلى في ربيع جمالها
وهضاب نجد في مراعيها المها   وظباؤها الخفرات ملء حجالها
والعشق فياض وأمة أحمد   يتحفز التاريخ لاستقبالها
لو حاولت فوق السماء مكانة   رفت على شمس الضحى بهلالها
ما بالها تلقى الجحود وعوائرا   وتصدها الأيام عن آمالها

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا — رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا!
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا — پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی — اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیٔ غیرِ سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

هجر الحبيب رحى الأحبة بالنوى	وأصابهم بتصرم الآمال
لم يبق في الأرواح غير بقية	رحماك يا مرآة كل جمال
لو قد مللنا العشق كان سبيلنا	أن نستكين إلى هوى وضلال
أو نصنع الأصنام ثم نبيعها	حاشا لموحد أن يذل لمال
أيام سلمان بنا موصولة	ونقى أويس في أذان بلال
يا طيب عهد كنت فيه منارنا	فبعثت نور الحق من فاران
وأسرت فيه العاشقين بلمحة	وسقيتهم راحا بغير دنان
أحرقت فيه قلوبهم بتوقد	الإيمان لا بتلهب النيران
لم نبق نحن ولا القلوب كأنها	لم تحظ من نار الهوى بدخان
إن لم يروحه الحبيب بوصله	فمكان حزن القلب كل مكان
يا فرحة الأيام حين نرى بها	روض التجلي وارف الأغصان
ويعود محفلنا بحسنك مسفرا	كالصبح في إشراقه الفينان
قد هاج حزني أن أرى أعداءنا	بين الطلا والطل والألحان
ونعالج الأنفاس نحن ونصطلي	في الفقر حين القوم في بستان
أشرق بنورك وابعث البرق القديـ	ـم بومضة لفراشك الظمآن

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟ بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا؟

عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے

آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں ؟

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے

دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے

برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

أشواقنا نحو الحجاز تطلعت — لحنين مغترب إلى الأوطان

إن الطيور وإن قصصت جناحها — تسمو بفطرتها إلى الطيران

قيثارتي مكبوتة ونشيدها — قد مل من صمت ومن كتمان

واللحن في الأوتار يرجو عازفا — ليبوح من أسراره بمعان

والطور يرقب التجلي صارخا — بهوى المشوق ولهفة الحيران

أكبادنا احترقت بأنات الجوى — ودماؤنا نهر الدموع القاني

والعطر فاض من الخمائل والربى — وكأنه شكوى بغير لسان

أوليس من هول القيامة لن تكو — ن الزهر نماما على البستان

النمل لا يخشى سليمانا وإنا — حرست قراه عناية الرحمن

أرشد براهمة الهنود ليرفعوا — الإسلام فوق هياكل الأوثان

ما بال أغصان الصنوبر قد نأت — عنها قماريها بكل مكان

وتعرت الأشجار من حلل الربى — وطيورها فرت إلى الوديان

يارب إلا بلبلا لم ينتظر — وحي الربيع ولا صبا نيسان

ألحانه يجري جرى متلاطما — فكأنه الحاكي عن الطوفان

ياليت قومي يسمعون شكاية — هي في ضميري صرخة الوجدان

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

إن الجواهر حيرت مرآته ... هذا القلب فهو على شفا البركان

أسمعتهم يا رب ما ألهمتني ... وأعد إليهم يقظة الإيمان

وأذقتهم الخمر القديمة إنها ... عين اليقين وكوثر الرضوان

أنا أعجمي الدن لكن خمرتي ... صنع الحجاز وكرمها الفينان

إن كان لي نغم الهنود ولحنهم

لكن هذا الصوت من عدنان،

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں — کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں — جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں — پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

جواب شكوى

كلام الروح للأرواح يسري ـــ وتدركه القلوب بلا عناء
هتفت به فطار بلا جناح ـــ وشق أنينه صدر الفضاء
ومعدنه ترابي ولكن ـــ جرت في لفظه لغة السماء
لقد فاضت دموع العشق مني ـــ حديثا كان علوي النداء
فحلق في ربا الأفلاك حتى ـــ أهاج العالم الأعلى بكائي
تحاورت النجوم وقلن صوت ـــ بقرب العرش موصول الدعاء
وجاوبت المجرة علّ طيفا ـــ سرى بين الكواكب في خفاء
وقال البدر هذا قلب شاك ـــ يواصل شدوه عند المساء
ولم يعرف سوى رضوان صوتي ـــ وما أحراه عندي بالوفاء
ألم أك قبل في جنات عدن ـــ فأخرجني إلى حين قضائي

جوابِ شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے　　خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ نظر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی　　بولے سیّارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا، نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی　　کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنّت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

وقيل هو ابن آدم في غرور　　تجاوز قدره دون ارعواء
لقد سجدت ملائكة كرام　　لهذا الخلق من طين وماء
يظن العلم في كيف وكم　　وسر الخير عنه في انطواء
وملء كؤوسه دمع وشكوى　　وفي أنغامه صوت الرجاء
فيا هذا لقد أبلغت شيئا　　وإن أكثرت فيه من المراء

عطايانا سحائب مرسلات　　ولكن ما وجدنا السائلينا
وكل طريقنا نور ونور　　ولكن ما رأينا السالكينا
ولم نجد الجواهر قابلات　　ضياء الوحي والنور المبينا
وكان تراب آدم غير هذا　　وإن يك أصله ماء وطينا
ولو صدقوا وما في الأرض نهر　　لأجرينا السماء لهم عيونا

وأخضعنا لملكهم الثريا　　وشيدنا النجوم لهم حصونا
ولكن ألحدوا في خير دين　　بنى في الشمس ملك الأولينا
تراث محمد قد أهملوه　　فعاشوا في الخلائق مهملينا
تولى هادم الأصنام قدما　　فعاد لها أولئك يصنعونا
أباهم كان إبراهيم لكن　　أرى أمثال آزر في البنينا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا؟

تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا
آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں؟

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے تم بھی نئے

وفي أسلافكم كانت مزايا ... بكلّ فمٍ لذكراها نشيدُ

تضوّع شقائق الصحراء عطرا ... بريّاها وتبتسم الورودُ

فهل بقيت محاسنهم لديكم ... فيجمل في ولائكم الصدودُ

لقد هاموا بحانهم ثناءً ... فلم يكتب لغيرهم الخلودُ

وكوثر أحمدٍ منكم قريبٌ ... ولكن شوقكم عنه بعيدُ

وكم لاح الصباح سنا وبشرى ... وأذّنت القماري والطيورُ

وكبّرت الحمائل في رباها ... مصلّيةً تجاوبها الغديرُ

وكنتم صباحكم أبدا تقيلُ ... كأنّ الصبح لم يدركه نورُ

وأضحى الصوم في رمضان قيدا ... فليس لكم به عزمٌ صبورُ

تمدّن عصركم جمع المزايا ... وليس يغايب إلا الضميرُ

لقد ذهب الوفاء فلا وفاءٌ ... وكيف ينال عهدي الظالمينا

إذا الإيمان ضاع فلا أمانٌ ... ولا دنيا لمن لم يحيِ دينا

ومن رضي الحياة لغير دينٍ ... فقد جعل الفناء لها قرينا

وفي التوحيد للهمم اتحادٌ ... ولن تبنوا العلا متفرقينا

تساندت الكواكب فاستقرت ... ولولا الجاذبية ما بقينا

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا، اللہ کا سودائی تھا کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کرلو
ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کرلو!

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

عدوتم في الديار بلا ديار ‏ وأنتم كالطيور بلا وكور
وكل صواعق الدنيا سهام ‏ لتبديركم وأنتم في غرور
أهذا الفقر في علم ومال ‏ وأنتم في القطيعة والنفور
وبيع مقابر الأجداد أضحى ‏ لدى الأحفاد مدعاة الظهور
سيعجب تاجر الأصنام قدما ‏ إذا سمعوا بتجار القبور

عدوتم في الديار بلا ديار ‏ وأنتم كالطيور بلا وكور
وكل صواعق الدنيا سهام ‏ لتبديركم وأنتم في غرور
أهذا الفقر في علم ومال ‏ وأنتم في القطيعة والنفور
وبيع مقابر الأجداد أضحى ‏ لدى الأحفاد مدعاة الظهور
سيعجب تاجر الأصنام قدما ‏ إذا سمعوا بتجار القبور

من المتقدمون إلى المعالي ‏ على نهج الهداية والصواب؟
ومن جبهاتهم أنوار تبقى ‏ وفي أخلاقهم يتلى كتابي
أما كانوا جدودكم الأولى ‏ بناة المجد والفن العجاب
وليس لكم من الماضي تراث ‏ سوى شكوى اللغوب والاكتئاب
ومن يك يومه في العيش يأسا ‏ فما غده سوى يوم العذاب

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو؟

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے، موسیٰ ہی نہیں

أتشكو أن ترى الأقوام فازوا   بمجد لا يراه النائمونا

مشوا بهدى أوائلكم وجدّوا   وضيّعتم تراث الأولينا

أيحرم عامل ورد المعالي   ويسعد بالرقي الخاملونا

أليس من العدالة أن أرضي   يكون حصادها للزارعينا

تجلّى النور فوق الطور باق   فهل بقي الكليم لطور سينا

ألم يبعث لأمتكم نبي   يوحدكم على نهج الوئام

ومصحفكم وقبلتكم جميعا   منار للأخوة والسلام

وفوق الكل رحمن الرحيم   إله واحد رب الأنام

فما نهار ألفتكم تولى   وأمسيتم حيارى في الظلام

وحسن اللؤلؤ المكنون رهن   لصوغ العقد في حسن النظام

وكيف تغيرت بكم الليالي   وكيف تفرقت بكم الأماني

تركتم دين أحمد ثم عدتم   ضحايا للهوى أو للهوان

رقي الشعب قد أضحى لديكم   تقرره صلاحية الزمان

وكيف تقاس أوهام ولغو   بحكمة منزل السبع المثاني

أرى نارا قد انقلبت رمادا   سوى ظل مريض من دخان

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امراء نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غرباء کے دم سے

أرى الفقراء عباداً تقاةً　　قياماً في المساجد راكعينا
هم الأبرار في صوم وفطر　　وبالأسحار هم يستغفرونا
وليس لكم سوى الفقراء ستر　　يواري عن عيوبكم العيونا
أضلت أغنياءكم الملاهي　　فهم في ريبهم يترددونا
وأهل الفقر ما زالوا كنوزاً　　لدين الله رب العالمينا

أرى التكبير أدركه خمول　　ولم يبق العزائم في اشتعال
وأصبح وعظكم من غير سحر　　ولا نور يطل من المقال
وعند الناس فلسفة وفكر　　ولكن أين تلقين (الغزالي)
وجلجلة الأذان بكل أرض　　ولكن أين صوت من بلال
منائركم علت في كل حي　　ومسجدكم من العباد خالي

فأين أئمة وجنود صدق　　تهاب شباة عزمهم الحراب
إذا صنعوا فصنعهم المعالي　　وإن قالوا فقولهم الصواب
مرادهم الإله فلا رياء　　ونهجهم اليقين فلا ارتياب
لأمتهم وللأوطان عاشوا　　فليس لهم إلى الدنيا طلاب
كمثل الكأس تبصرها دهاقاً　　وليس لأجلها صنع الشراب

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی   برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی   فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

دمِ تقریر بھی مسلم کی صداقت بیباک   عدل اس کا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک   تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

ہر مسلماں رگِ باطل کیلئے نشتر تھا   اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا   ہے تمہیں موت کا ڈر اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

جهادُ المؤمنين لهم حياةٌ ألا إنّ الحياةَ هي الجهادُ
عقائدُهم سواعدُ ناطقاتٌ وبالأعمالِ يثبتُ الاعتقادُ
وخوفُ الموتِ للأحياءِ قبرٌ وخوفُ اللهِ للأحياءِ زادُ
أرى ميراثَهم أضحى لديكم مُضاعًا حيث قد ضاعَ الرشادُ
وليس لوارثٍ في الخيرِ حظٌّ إذا لم يحفظِ الإرثَ اتّحادُ

لأيّ مآثرِ القومِ انتسبتم؟ لتكتسبوا افتخارَ المسلمينا
فأين مقامُ ذي النورين منكم ودولتُه عزّةُ دنيا ودينا
وفقرُ عليٍّ الأوّابِ هلّا ربحتم فيه كنزَ الفاتحينا
أقمتم في الذنوبِ وفي الخطايا وتغتابون حتى الصالحينا
وهم ستروا عيوبَ الخلقِ فضلًا وإن كانوا أبرَّ المتقينا

أريكةُ قيصرٍ وسريرُ كسرى قد احتميا بملكِهمُ العميمِ
أأنتم تطمحون إلى الثريّا بلا عزمٍ ولا قلبٍ سليمِ
تضيعون الإخاءَ وهم أقاموا صروحَ إخائِهم فوقَ النجومِ
طلبتم زهرةَ الدنيا وعدتم بلا زهرٍ يضوعُ ولا شميمِ
وكان لديهمُ البستانُ مغنًى وهم أصحابُ جنّاتِ النعيمِ

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطابیں وہ خطاپوش ورحیم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا سریرِ کے بھی،
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خود دار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
اُن کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

يعيد الكون قصتهم حديثا ... ويُنشي من حديثهم الفنونا

فكم نزحوا عن الأوكار شوقا ... إلى التحليق فوق العالمينا

ويأس شبابكم أدمى خطاهم ... فظنوا فيه بالدين الظنونا

هي المدنية الحمقاء ألقت ... بهم حول المذاهب حائرينا

لقد صنعت لهم صنم الملاهي ... لتحجب عنهم الحرم الأمينا

لقد سئم الهوى في البيد قيس ... ومل من الشكاية والعذاب

يحاول أن يباح العشق حتى ... يرى ليلاه وهي بلا حجاب

يريد سفور وجه الحسن لما ... رأى وجه الغرام بلا نقاب

فهذا العهد أحرق كل غرس ... من الماضي وأغلق كل باب

لقد أنشت صواعقه المغاني ... وعاثت في الجبال وفي الهضاب

هي النار الجديدة ليس يبقى ... لها حطب سوى المجد القديم

خذوا إيمان إبراهيم تنبت ... لكم في النار روضات النعيم

ويذكو من دم الشهداء ورد ... سني العطر قدسي النسيم

ويلمع في سماء الكون لون ... من العناب مخضوب الأديم

فلا تفزع إلى المرجان أضحى ... عقودا للبراعم والكروم

قیس زحمت کشِ تنہائیِ صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلا نہ رہے
گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رُسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محرومِ ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں
سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام کا نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

فكم ذالت رياض من رباها ... وكم بارت نخيل في البوادي

ولكن نخلة الإسلام تنمو ... على مر العواصف والعوادي

ومجدك في حمى الإسلام باق ... بقاء الشمس والسبع الشداد

وإنك يوسف في أي مصر ... يرى كنعانه كل البلاد

تسير بك القوافل مسرعات ... بلا جرس ولا ترجيع حادي

ضياؤك مشرق في كل أرض ... لأنك غير محدود المكان

بغت أمم التتار فأدركتها ... من الإيمان عاقبة الأمان

وأصبح عابدو الأصنام قدما ... حماة الحجر والركن اليماني

فلا تجزع فهذا العصر ليل ... وأنت النجم يشرق كل آن

ولا تخش العواصف فيه انهض ... بشعلتك المضيئة في الزمان

أعد من مشرق التوحيد نورا ... يتم به اتحاد العالمينا

وأنت العطر في روض المعالي ... فكيف تعيش محتبسا دفينا

وأنت نسيمه فاحمل شذاه ... ولا تحمل غبار الحنا مليا

وأرسل شعلة الإيمان شمسا ... وصغ من ذرة جبلا حصينا

وكن في قمة الطوفان موجا ... ومزنا يمطر الغيث الهتونا

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

فيا سر محمد شمس البرايا ... أتيت خيمة الفلك المنير
تلألأ في الرمال وفي الصحاري ... وفوق الموج والسيل المغير
ونبض الكون منه مستمد ... حرارته على مر العصور
ومن مراكش يغزو صداه ... ربوع الصين بالصوت الجهير
وما مشكاة هذا النور إلا ... ضمير المسلم الحر الغيور

ورفع الذكر للمختار رفع ... لقدرك نحو غايات الكمال
فكن إنسان عين الكون واشهد ... مقامك عاليا فوق المعالي
بخنجر عزمك الوثاب لاحت ... على الأعلام أنوار الهلال
نداؤك في العناصر مستجاب ... إذا دوى بصوت من بلال
وعقلك في الخطوب أجل درع ... وعشقك خير سيف للنضال

خلافة هذه الأرض استقرت ... بمجدك وهو للدنيا سماء
وفي تكبيرك القدسي يبدو ... صغيرا كل ما ضم الفضاء
فيا من هب للإسلام يدعو ... وأيقظ صدق غيرته الوفاء
سترفع قدرك الأقدار حتى ... تشاهد أن ساعدك القضاء
وقيل لك احتكم دنيا وأخرى ... وشأنك والخلود كما تشاء

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا — رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے — بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے — رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دُنیا — وہ تمہارے شہدا پالنے والی دُنیا

گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دُنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دُنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح

غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری — مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری — تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

فاطمة الزهراء

نسب المسيح بني لمريم سيرة ... بقيت على طول المدى ذكراها

والمجد يشرق من ثلاث مطالع ... في مهد فاطمة نما أعلاها

هي بنت من؟ (١) هي زوج من؟ (٢) هي أم من؟ (٣) ... من ذا يداني في الفخار أباها

هي ومضة من نور عين المصطفى ... هادي الشعوب إذا تروم هداها

هو رحمة للعالمين، وكعبة الله ... آمال في الدنيا وفي أخراها

من أيقظ الفطرة النيام بروحه ... وكأنه بعد البلا أحياها

وأعاد تاريخ الحياة جديدة ... مثل العرائس في جديد حلاها

ولزوج فاطمة بسورة "هل أتى" ... تاج يفوق الشمس عند ضحاها

أسد بحصن الله يرمي المشكلات ... بصيقل يمحو سطوه رجاها

إيوانه كوخ وكنز ثرائه ... سيف غدا بيمينه تياها

في روض فاطمة نما غصنان لم ... ينجبهما في النيرات سواها

فأمير قافلة الجهاد، وقطب ذا ... مركز الوئام والاتحاد، أباها

حسن الذي صان الجماعة بعدما ... أمسى تفرقها يحل عراها

ترك الخلافة ثم أصبح في الدنيا ... إمام الفتيا وحسن علاها

وحسين في الأبرار والأحرار ما ... أزكى شمائله وما أنداها

فتعلموا رى اليقين من الحسـ ـنين إذ الحوادث أظلمت بلظاها
وتعلموا حرية الإيمان مـن ـصبر الحسين وقد أجاب نداها
الأمهات يلدن للشمس الضيا ءَ وللجواهر حسنها وصفاها
ما سيرة الأبناء إلا الأمهـا ت فهم إذا بلغوا الترقي صداها
هي أسوة للأمهات وقدوة يترسم القمر المنير خطاها
لما شكا المحتاج خلف رحابها رقت بتلك النفس في شكواها
جادت للمقتدة برهن خمارها يا سيب أين نداك من جدواها
نور تهاب النار قدس جلاله ومنى الكواكب أن تنال ضياها
جعلت من الصبر الجميل غذاءها ورأت رضى الزوج الكريم رضاها
فمها مرتل آي ربك بينما يدها تدير على الشعير رحاها
بلت وسادتها لآلي دمعها من طول خشيتها ومن تقواها
جبريل نحو العرش يرفع دمعها كالطل يروي في الجنان رباها
لولا وقوفي عند أمر المصطفى وحدود شرعته ونحن فداها
لمضيت للتطواف حول ضريحها وغمرت بالقبلات طيب ثراها

الكتاب الثالث

کتاب ثالث

اقبال کا خاندان

باغِ ارم کشمیر کے کسی قریہ میں کسی زمانہ میں ایک خاندان دودمان سکونت پذیر تھا۔ نظرِ رحمت پروردگار اس پر پرتو فگن ہوئی اور اس نے بت پرستی کے جال سے نکل کر اسلام کے آغوش میں پناہ لی اور طاغوتی ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس اولوالعزم خاندان نے ترکِ مذہب کے ساتھ ترکِ وطن کرنا بھی ضروری جانا اور اسلام پاک کے نام پر گلزار کشمیر کو سیالکوٹ کے اسلام خیز طبقہ پر قربان کر دیا اور ہمیشہ کے لئے وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ یہ نئی تبدیلی پختہ ہو گئی یا حلاوتِ ایمانی جب کئی پشتوں کے دلوں میں رچ گئی اور غیر اللہ کی پرستش کی بو باس کا کلی طور پر استیصال ہو گیا تو رحمتِ باری نے ایک بار پھر اس مہاجر اور مجاہد خاندان پر اپنے کرم کی بارش کی اور (غالباً ۱۸۳۷ء کی) کسی مبارک ساعت میں ایک بااقبال فرزند اسے عطا کیا اور اس کے قلب و روح کی پاکیزگی کے مطابق اسے نور محمد کے مبارک نام سے سرفراز کیا۔

شیخ نور محمد صاحب علمِ ظاہری کی دولت سے کماحقہ، مالامال نہ تھے لیکن علمِ لدنی کا خزانہ تھے۔ علماء و اصفیاء کی پاک صحبت نے ان کے مسِ خام کو کندن بنا دیا تھا۔ وہ متقی و متورع تھے۔ وہ زاہد شب زندہ دار تھے۔ ہوا و ہوس کے طوفان سے اور شیطانوں کی شیطنت سے اپنے پاکیزہ بیٹے کو بچانے کے لئے

مقدس والدین نے اپنے معیار کے مطابق عین عنفوانِ شباب میں نور محمدؒ کی شادی کردی اور ایزد اقدس و اکبر نے بحکم الطیبات للطیبین ایک پاکیزہ صورت و سیرت کی مالک بیوی عطا کردی۔

دونوں میاں بیوی کی زندگی صحابہؓ و امہات المومنین کے اسوۂ پاک کی تقلید کا بہترین نمونہ تھی۔ اکلِ حلال و صدقِ مقال ان کے کردار و سیرت کی بنیاد تھا عبادت و ریاضت ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا خشیتِ الٰہی سے ہمہ وقت ترساں و لرزاں رہنا حرص و ہوس سے گریزاں ہونا قناعت و استغنا اختیار کرنا ان کا شعار تھا۔ بیوی کے زہد و تقویٰ کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے۔

نور محمد صاحب کسی افسر کے ہاں ملازم تھے۔ بیوی کو تحقیق نہیں صرف وہم تھا کہ یہ سرکاری افسر شاید رشوت لیتا ہو اس لئے ان کا معمول تھا کہ شوہر کی ہر مہینہ جب تنخواہ آتی تھی تو وہ اس روپے کو جب تک بدل نہ لیتی تھیں۔ کام میں نہ لاتی تھیں۔ اسی کا نام تقویٰ سے بڑھ کر تورع ہے۔ شیخ نور محمدؒ صاحب کے بارے میں سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن جیسے مبصر و نکتہ رس نے فرمایا ہے کہ اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے مگر ان کا رنگ تصوف ایسا نہ تھا کہ انہیں رہبانیت کی طرف مائل اور زندگی کے فرائض سے بے پرواہ کر دے ساری عمر زورِ بازو سے کمایا اور ہر آن دل خدا کی طرف لگایا۔ "دل بہ یار دست بکار" بران کا صحیح معنی میں عمل تھا۔

عین عنفوانِ شباب میں نور محمد صاحب کو اللہ عزوجل نے ایک فرزند عطا فرمایا جس کا نام انہوں نے عطا محمد رکھا۔

علامہ اقبال کی پہلی بیگم یعنے والدۂ آفتاب اقبال صاحب

جب عطا محمد پیدا ہوئے تو شیخ نور محمد صاحب کی عمر تقریباً ۲۳ سال تھی عطا محمد صاحب کا سال پیدائش ۱۸۶۰ء ہے ۲۳ سال کی عمر کے حصہ میں (بلکہ بیس سے چالیس سال تک) عام طور سے اخلاط میں ہیجان برپا ہوتا ہے عقل خام ہوتی ہے ہر قدم پر لغزش مستانہ کا امکان قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا خاندان کو عزت اور اقبال بخشنے والا اقبال اس عہد میں بھلا کیوں جنم لیتا۔ اس نے توقف کیا یہاں تک کہ شیخ نور محمد صاحب کی خرد نے پختگی توانائی اور سلامتی حاصل کر لی۔ اور ان کا اخلاقی حسن نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ تو اللہ عزوجل نے انہیں اقبال عطا فرمایا شیخ صاحب کی عمر اس وقت تقریباً چالیس سال تھی۔ اور ۱۸۷۳ء یا بروایتے ۱۸۷۷ء تھا۔

اقبال کی پرورش

اقبال کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانا، نیک ماں کی گود میں پرورش پائی۔ گفتار کی صداقت، کردار کی بلندی، اہل فقر سے محبت، اہل دولت سے بے نیازی، عزت، جرأت، صبر، قناعت، خدا ترسی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباق اس ذہانت و فطانت کے حسین پیکر نے اپنے گھر میں پڑھے جو اس کی گھٹی میں ملے اور بنیاد میں پڑے۔

اقبال کی تعلیم

گھر کا ماحول، گھر کی تعلیم خالص مذہبی تھی۔ بلکہ عالمانہ و صوفیانہ بھی۔ شیخ نور محمد صاحب نے اپنی شان کے مطابق اقبال کو مذہبی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک بہترین اتالیق کا انتخاب کیا۔ یہ اتالیق تھے مولوی میر حسن صاحب جو عالی نسب بھی تھے جامع علوم بھی تھے۔ شریعت کے عالم و عامل، طریقت میں کامل تھے، علم دوست تھے

خوشنویس بھی تھے۔ خوش تقریر بھی تھے۔ شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے مرتب اور مہذب بھی تھے۔ اور شیخ نور محمد صاحب کے ذاتی دوست بھی تھے۔

فاضل استاد نے قابل شاگرد کو کتب متداولہ کے درس کے علاوہ شریعت کے گر سکھائے۔ طریقت کے رموز سے آگاہ کیا مقام خدا و مقام محمد سے آشنا کیا۔ اور اصل مذہب کی علماً و عملاً روح پھونکی۔

بلاشبہ یہ بھی اقبال کی خوش نصیبی تھی۔ جو ایسے استاد ملے اور گستاخی معاف یہ استاد کی بھی خوش اقبالی تھی۔ جو انہیں ایسا شاگرد ملا جس نے انہیں عالم سے شمس العلماء بنایا۔ اور نہ صرف خود نیکنامی و شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا بلکہ اپنے خاندان کے ساتھ اپنے استاد کے نام کو بھی چمکایا۔ مذہبی عقاید و اعمال کی صحیح تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال اسکول میں داخل ہوئے۔

آفتاب اقبال

ایم اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

خلف الصدق

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

آفتاب اقبال صاحب کا مبلغ علمی:

آفتاب اقبال حضرت علامہ اقبال کے بڑے صاحبزادے ہیں، جو خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد صاحب کے نواسے ہیں آپکی والدہ حضرت علامہ اقبال کی پہلی بیوی، خان بہادر صاحب کی بڑی بیٹی تھیں، جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہیں اور ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔

آفتاب صاحب پنڈادن خان ضلع شاہ پور میں ۱۸۹۹ء میں اپنی ننھیال میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے نانا سول سرجن کی حیثیت سے قیام پذیر تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اسکاٹ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں حاصل کی۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے آپ کو سینٹ اسٹیفن کالج دہلی بھیجا گیا۔ جہاں کہ مسٹر ایس کے رودرا جیسے قابل آدمی پرنسپل تھے، جو آفتاب صاحب کے تعلیمی عہد میں کئی سال تک اس خدمت پر مامور رہے۔

آپ کو مسٹر این کے سین اور مسٹر پی این مکرجی اور سی ایف اینڈریوز جیسے

علمی دُنیا میں شہرت رکھنے والے پروفیسروں سے فلسفہ اور دیگر مضامین پڑھنے کے مواقع میسر آئے مشن کالج دہلی میں علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کو اس لئے بھیجا تھا کہ مسٹر این کے مین جی کی علمی قابلیت اور دلکش طرزِ تعلیم کی شہرت دہلی کے حدود سے نکل کر سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی حضرت علامہ کے ذاتی دوست تھے اور حضرت علامہ کی علمی ادبی اور قومی خدمات کے مداح اور قدردان تھے۔

آفتاب صاحب نے انہی کی سرپرستی میں بی اے آنرز کا امتحان فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور سنہ ۱۹۲۱ء میں انہی قابل اساتذہ کی سرپرستی میں فلسفہ میں آپ نے ایم اے کیا۔ یہ قابل اساتذہ اس وقت جب دہلی یونیورسٹی نہ تھی سارے پنجاب و دہلی کے ممتحن بھی تھے پھر آپ کو آپ کے ماموں اور نانا نے لندن بھیج دیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا اور ستمبر ۱۹۲۴ میں تحقیقات فلسفہ میں آپ نے کمال حاصل کیا اور ماسٹر آف آرٹ کی ڈگری لی۔ (BY RECERCH OF PHILOSOPHY) پھر سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک مدرسۃ السنۂ شرقیہ لندن یونیورسٹی میں آپ اُردو زبان و ادب کے لیکچرر رہے پھر آپ نے سنہ ۱۹۳۱ء میں لنکنس اِن لندن سے بیرسٹری پاس کی اس کے بعد آپ وطن واپس آ گئے اور اسلامیہ کالج کلکتہ میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر اور یونیورسٹی آف کلکتہ میں فلسفہ کے لیکچرر ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ تک رہے پھر آپ دوسری جنگ کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی کے دفتر میں ڈائرکٹر کے عہدہ پر دو سال تک فائز رہے پھر آپ انگریزی زبان و ادب کے اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے سنہ ۱۹۷۱ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس

محترم آفتاب اقبال صاحب
(علامہ اقبال کے فرزند اکبر)

اس کے بعد یعنی ۱۹۴۲ء میں آپ نے پریکٹس بحیثیت بیرسٹر لاہور ہائی کورٹ میں شروع کردی۔ اب ۱۹۴۸ء سے بحیثیت بیرسٹر آپ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کراچی میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

تصانیف اقبال

	نام تصنیف	سال اشاعت			تعداد	
۱۔	اسرار خودی	۱۹۱۵ تا ۱۹۵۹ء	۶	ایڈیشن	۱۳۰۰۰	تیرہ ہزار
۲۔	پیام مشرق	۱۹۲۳ تا ۱۹۵۸ء	۹	"	۱۸۰۰۰	اٹھارہ ہزار
۳۔	بانگِ درا	۱۹۲۴ تا ۱۹۶۲ء	۲۶	"	۱۱۴۰۰۰	ایک لاکھ چودہ ہزار
۴۔	زبورِ عجم	۱۹۲۷ تا ۱۹۵۹ء	۷	"	۱۶۴۰۰	سولہ ہزار چار سو
۵۔	جاوید نامہ	۱۹۳۲ تا ۱۹۵۹ء	۱۴	"	۶۰۰۰	چھ ہزار
۶۔	بال جبریل	۱۹۳۵ تا ۱۹۶۲ء	۱۲	"	۶۲۰۰۰	باسٹھ ہزار
۷۔	پس چہ باید کرد	۱۹۳۶ تا ۱۹۵۹ء	۱۴	"	۱۱۰۰۰	گیارہ ہزار
۸۔	ضرب کلیم	۱۹۳۶ تا ۱۹۵۹ء	۱۰	"	۴۳۰۰۰	تینتالیس ہزار
۹۔	ارمغانِ حجاز	۱۹۳۸ تا ۱۹۵۹ء	۷	"	۲۲۰۰۰	بائیس ہزار

جملہ تین لاکھ پانچ ہزار چار سو

۳,۰۵,۴۰۰

افتتاحی تقریر

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر جناب آفتاب اقبال ایم اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لا نے جو تقریر انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل کراچی میں بزبان انگریزی کی تھی۔ اس کا ترجمہ محمد احمد رضوی سابق مترجم مجلس قانون ساز پاکستان نے اردو زبان میں کیا

سعادت مآب جناب صدر و معزز حاضرین!

بڑی عزت افزائی ہے کہ کراچی کونسل نے مجھے جلسہ کے افتتاح کرنے کی خدمت پر مامور کیا۔ میں ان جذبات اور احساسات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ جو مجھے یہ عزت بخشنے کے محرک ہوئے۔ ہم لوگ یہاں ایسی برگزیدہ ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے ہیں جسے بجا طور پر پاکستان کا روحانی باپ کہا جاسکتا ہے باوجودیکہ علامہ اقبال کی وفات کو تیس سال گزر چکے ہیں مگر وہ آج بھی روحانی طور پر ہم سے اتنے ہی قریب ہیں جس قدر اپنی زندگی میں تھے۔ مرور ایام نے انہیں ہم سے اس لئے اور بھی قریب کر دیا ہے کہ انہوں نے اپنے جن خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں نصف صدی سے پہلے کیا تھا۔ انہی خیالات کا عکس کچھ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پہاڑ کے دامن میں تاریکی ہوتی

ہے مگر جوں جوں ہم اس کی بلندیوں پر چڑھتے جاتے ہیں فضا صاف اور روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان کی آنے والی نسلیں خصوصاً اور ساری دنیا عموماً انہیں ہم سے بھی زیادہ روشنی میں دیکھے گی جیسا کہ انہوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے: "لوگ میرا کلام میری زندگی میں نہ سمجھیں گے کیونکہ میں مستقبل کا شاعر ہوں۔"

علامہ اقبال نے یونینسٹ پارٹی کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اس پارٹی کا نصب العین یہ تھا کہ مسلم لیگ کو کمزور کرنے کے لئے مسلمانوں میں تشتت اور افتراق پیدا کیا جائے تاکہ وہ تقسیم ہند کے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخرکار یونینسٹ پارٹی کو قائد اعظم نے ۱۹۴۶ء میں ختم کیا۔

اسی زمانہ میں شاعر مشرق نے اپنے سیاسی دشمنوں کے ہاتھوں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ ان لوگوں نے ان کا اثر کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ جب شیخ دین محمد مرحوم مسلم لیگ کو چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تو انہیں ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ اس زمانہ میں پنجاب میں مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کرنے والے صرف دو شخص باقی رہ گئے ایک ملک برکت علی اور دوسرے شاعر مشرق۔ ذیل میں شاعر مشرق کے کلام کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جو انہوں نے اپنی مصیبت کے زمانہ میں کہا تھا:

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو برگ گیا ہے نہ دہی اہلِ خرد را — او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

قدرت سے ہے ہمسایۂ افلاک مرا فکر
کر دے ہے اسے اب چاند کی غاروں میں نظربند

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے [illegible] کو کہے کوہِ دماوند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک

وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

فلک سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن

خودی کی عمارت پر جس نے دوسری کیا ہے

ڈاکٹر اقبال کے خلاف مخالفت کا ایک بڑا طوفان برپا ہو گیا تھا مگر وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک چٹان کی طرح جمے رہے۔ ان کے ہندو اور مسلمان دشمنوں نے انہیں اور ان کے خاندان کو نہ چھوڑا۔ اگرچہ انہیں اپنے اصولوں کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینی پڑی مگر ان کے دل میں اپنے کسی دشمن کے لئے نفرت اور عداوت کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔ میں نے ان کی طرح کسی شخص کو نہیں دیکھا جس کی محبت اور نفرت اس قدر گہری ہو۔ شاعر مشرق نے مختلف اشعار میں مرد بزرگ کی جو علامات بیان کی ہیں وہ خود ان پر منطبق ہوتی ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق　　قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں　　ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو　　شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں　　بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

جب ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو سکندر حیات کی یونینسٹ حکومت نے انہیں شاہی مسجد کی حدود میں دفن کرنے کی بڑی سخت مخالفت کی مگر چونکہ صوبائی گورنر ان کی قدر و منزلت پہچانتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے بڑے پر خلوص اور بے غرض لیڈر ہیں۔ اسی لئے اپنی ذمہ داری پر مرکزی حکومت سے اجازت حاصل کئے بغیر انہیں شاہی مسجد کی حدود میں دفن کرنے کی اجازت دیدی۔

جب دُنیا کے بادشاہ، شہزادے، اہل قریہ، ماہرینِ سیاست، والیانِ ریاست اور غیر ممالک کے سفراء شاعرِ مشرق کے مزار پر پھول چڑھانے آئے تو اُن کے تمام مفاد پرست دشمن غائب ہو گئے۔ علامہ اقبال کا نام تاریخ عالم میں اس وجہ سے زندۂ جاوید رہے گا۔ کہ انہوں نے نہایت ایمانداری اور خلوص کے ساتھ عوام کی خدمت کی ہے۔ اور اپنے کلام سے لوگوں کے دلوں میں جوشِ عمل پیدا کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ دُنیا کے ممتاز ترین شاعر ہیں۔ مگر جس چیز نے انہیں تاریخ عالم میں زندۂ جاوید کیا ہے۔ وہ نہ تو ان کی شاعری ہے نہ اُن کا تبحرِ علمی ہے۔ نہ اُن کی غیر معمولی ذہانت ہے نہ ان کے عمیق تصورات اور بلند خیالات ہیں گو ان کی عالمگیر شہرت میں ان تمام صفات کا حصہ ہے۔ مگر درحقیقت جس چیز نے انہیں عمرِ فانی بنا دیا وہ ان کی صداقت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ نیز ان کا خلوص اور اصلاحی جذبہ تھا جسے لے کر وہ اپنے اصولوں کی تبلیغ کرتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی حقوق کی حمایت کرتا تھا۔ اور یہ کہ وہ جدید نظریات کی روشنی میں تبلیغِ اسلام کی خدمت انجام دیتے رہے انہی علمی اوصاف نے انہیں نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں اعلیٰ مقام عطا کیا بلکہ سارے عالم میں انہیں بقائے دوام بخشی۔ اہل مغرب کو اسلام کا صحیح مفہوم وہی شخص سمجھا سکتا ہے، جو اسلامی تعلیمات سے کماحقہٗ واقف ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپ کے فلسفہ اور جدید سائنس میں بھی مہارت تامہ رکھتا ہو۔ جس شخص نے

علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات ضرور سمجھ لے گا کہ انہیں ما
مابعد الطبعیات، حیاتیات اور معاشیات کا پورا پورا علم تھا۔ انہوں نے جس
نظریات، سائنس، فلسفہ اور ادب کا اتنا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ کہ وہ کسی مذہبی یا
مسئلہ کو حل کرنے میں اپنی انہی معلومات سے استفادہ کرتے تھے۔ مثلاً
صوبہ میں واحد عالم تھے جس نے آئنسٹائن (Einstein) کے نظریہ اضا
کے سائنسی اور فلسفی دونوں پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور جس نے ان کے
کے نظریۂ مکان وزمان کو مذہب کی روشنی میں سمجھا تھا۔

معزز حضرات! میں اس موقعہ پر اس مسئلہ پر طائرانہ نظر ڈالوں گا کہ
کے بارے میں علامہ اقبال کا نظریہ کیا تھا۔ ان کے جن پرستاروں کا یہ دعویٰ
کہ وہ اس مسئلے میں علامہ اقبال کے نظریے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں
علامہ اقبال کو مسلم کمیونسٹ اور مغربی جمہوریت کا علمبردار ظاہر کیا
اس سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ اور حق وصداقت سے دور اور کوئی دعویٰ نہیں ہو
ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا عقیدہ رکھتے
مگر ان کا یہ عقیدہ اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی نظام تک ہی محدود تھا
چنانچہ جہاں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ نجی جائیدادوں پر پابندیاں لگائی جائیں
وہاں وہ ملکی مصنوعات کو قومی بنانے کے بھی مخالف تھے۔ اسلامی نظریات
کے مطابق ان کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ اگر کسی اسلامی حکومت کو ضرورت پیش آئے تو وہ
تمام مالکان کی جائیداد کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اگر بوقت ضرورت
حکومت تمام نجی جائیدادوں کو اپنی تحویل میں لے لے۔ تو اس سے یہ قانون

ئے بنایا جا سکتا۔ کہ تمام نجی جائیدادوں کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ جیسا
روس میں ہو رہا ہے۔ کیونکہ وہاں کمیونزم کے نظریہ کے مطابق ملک کی ساری
ر اوار قومی ملکیت ہوتی ہے اور جائیداد کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص
ے اخراجات کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے نظریے کی رو سے
تمالیت اور سرمایہ داری دونوں انسان کے جسم کو تو فربہ کرتی ہیں۔ مگر اس کی
رح کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اسلام کمیونزم کے خلاف ہے کیونکہ کمیونزم میں خدا
وجود کا عقیدہ نہیں ہے۔ اور وہ اقتصادیات پر زور دیتا ہے۔ علامہ اقبال
نظریہ کے مطابق اسلام کا اقتصادی نظام جسے نظام ربوبیت کے نام سے
م کیا جاتا ہے وہ کمیونزم سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے، ایک روز ایسا
گا۔ کہ اسلام کا اقتصادی نظام کمیونزم کو بالکل ختم کر دے گا۔ کیونکہ اسلام کا
قتصادی نظام خالق کائنات کے وجود پر قائم ہے اور وہی انسان کی خودی
ج کمال تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے اور وہی انسان کی جسمانی نشوونما
ہے۔

معزز حاضرین! میں اس موقع پر ضروری سمجھتا ہوں کہ شاعر مشرق کے
اشتمالیت پر روشنی ڈالوں۔ بعض لوگوں نے اشتمالیت کے پس منظر میں
شرق کے خیالات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ گمراہ کن ہے۔ کیونکہ اسے دیکھ
یہ خیال کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے معاشرتی اور اقتصادی نظریات
اور چین کے انقلاب سے ماخوذ ہیں۔ ہمیں اس تصویر کشی پر تو کوئی اعتراض
ہے البتہ ہمیں اس تصویر کے مصوروں پر ضرور اعتراض ہے تاکہ انہیں

غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچایا جاتے۔

شاعر مشرق روس اور چین کے انقلاب سے بہت پہلے انقلابی ذہنیت رکھتے تھے۔ اگر وہ کسی اسلامی مملکت کے حکمران ہوتے اور انہیں مطلق العنان بادشاہ کے اختیارات حاصل ہوتے۔ تو وہ یقیناً موجودہ سرمایہ داری اور اشتمالیت کے خلاف جہاد کرتے اور وہ اپنی حکومت میں اسلام کا اقتصادی نظام جاری کرتے کیونکہ اسلام کے اقتصادی نظام میں وہ بے انصافی نہیں ہے جو اشتمالیت اور سرمایہ داری کے نظام میں ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں اشتمالیت اور سرمایہ داری کو بہت عمدہ طریقہ پر سمو دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ اسلام کا قانون وراثت سرمایہ داری اور اشتمالیت کی جڑ پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ قانون وراثت کی رو سے شخصی ملکیت قائم ہوتی ہے۔ اور بوقت ضرورت وہ ختم بھی کی جا سکتی ہے روس نے مارکس اور لینن کے نظام میں ترمیم کر دی ہے اور وہ بتدریج خدا کے وجود کا قائل ہو کر اسلام کے قریب آتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی نظام میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے نیز ان میں خدا کے وجود کا عقیدہ بھی پیدا ہوتا جا رہا ہے جو انسانی معاشرہ کے تحفظ کے لئے ضروری ہے گو یہ بات بظاہر بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے مگر آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ ایک دن آئے گا جب روس اور چین دونوں حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے جیسے تاتار ہو گئے۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

معزز حضرات! علامہ اقبال نے روس اور چین کے اس جذبہ کی بڑی تعریف کی ہے جس نے وہاں کے لوگوں کو انقلاب برپا کرنے کے لئے ابھارا تھا۔ وہ اس برصغیر میں سب سے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کمیونزم کا ذکر کیا ہے۔ جو مشہور نظم انہوں نے لینن پر لکھی ہے۔ وہ آپ حضرات کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے جو تصورات لینن کی زبان سے بیان کئے ہیں۔ ان سے کمیونزم کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اس میں مغربی سرمایہ داری پر بڑی زبردست ضرب لگائی گئی ہے۔ لینن دہریہ ہونے کے باوجود خدا کے دربار میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے ؎

اے انفس و آیات میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے — بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
بندے شب و روز کے جکڑے ہوئے بندے — تو خالق اعصار و نگارندۂ آفات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے — کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
گالوں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر میرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

علامہ اقبال نے مغربی جمہوریت کے متعلق حسب ذیل بیتوں میں بڑے دلچسپ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ جمہوریت ایک ایسا کوٹ ہے جسے یورپ ممالک نے تجربہ کرنے کے بعد اُتار پھینکا ہے۔ اور ایشیا کے بعض ملکوں نے ڈھیلا ہونے کے باوجود اسے پہن رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک کو ایسا قانونی لبادہ پہننا چاہیئے۔ جو اس کے جسم پر ٹھیک ہو۔ جمہوریت کا آغاز اس معنی میں کہ عوام کی حکومت ہو۔ عوام کے لئے ہو اور عوام کے ذریعے ہو۔ سب سے پہلے یونان کی ریاستوں میں ہوا تھا۔ جہاں یہ طرزِ حکومت کچھ عرصے قائم رہا اور اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار رہتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنے آپ کو بیرونی حملوں سے بچانا دشوار ہو گیا تھا جس کا انجام یہ ہوا کہ ان ریاستوں کی اندرونی اور بیرونی حالت تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے بعد جمہوری طرزِ حکومت جمہوریہ روم میں جاری ہوا مگر وہ جلد ہی شہنشاہیت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد پندرہ صدی تک یورپ میں کہیں جمہوری حکومت کا نام و نشان

نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے باشندوں نے سنہ ۱۲۵۰ء میں شاہ جون سے سیاسی حقوق چھین لیے۔

فرانس میں سنہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد فرانس میں جو جمہوری حکومت قائم ہوئی تھی اسے نپولین بوناپارٹ نے ختم کیا اور وہاں آج کل جنرل ڈیگال صدر کی حیثیت سے ڈکٹیٹر بنا ہوا ہے۔ اسپین میں جنرل فرانکو نے جمہوری حکومت ختم کی اور اٹلی میں مسولینی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

چین میں بھی جمہوری حکومت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ مگر وہاں وہ اس لئے کامیاب نہ ہو سکی کہ وہاں وہ اہل چین کے حالات سے موافقت نہ کر سکی وہاں کسی شخص نے بھی ہندوستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسی جمہوری حکومت کو پسند نہ کیا۔ جمہوری حکومت کے ہر جگہ ناکام ہونے کا سبب یہ ہے کہ لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہوتے کہ وہ اپنے صحیح نمائندوں کا انتخاب کر سکیں، نیز وہاں کا اخلاقی معیار بھی پست ہوتا ہے۔ دراصل وفاداری کوئی ذہنی چیز نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک اخلاقی حقیقت ہے۔ اخلاقی کردار کی تعریف یہ ہے کہ وہاں دیانتداری، سلامت روی، خوش اخلاقی، حب الوطنی، صبر و استقلال، تحفظ حقوق، اور اعتدال جیسی اخلاقی قدریں موجود ہوں اور یہی اوصاف نفرت، رشک و حسد، خود غرضی اور حماقت کا مقابلہ کر کے ان کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی اخلاقی کردار ہے۔ الغرض آجکل ہر ملک میں اس کے مناسب حال حکومت ہے اسلام میں جمہوریت ایک روحانی قدر ہے جس کی رو سے تمام مرد اور عورتیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ مغربی جمہوریت ایک سیاسی طریقہ کار ہے جس میں

ووٹ دینے والوں کی قابلیت اور صلاحیت کا لحاظ کئے بغیر صرف ان کی تعداد شمار کی جاتی ہے۔

اب میں ایک دو غلط تصورات کا تجزیہ کروں گا جنہیں علامہ اقبال کے ایک ثناخواں نے عوام کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ علامہ اقبال سے ذاتی طور پر واقف ہے۔ اس شخص نے ایک مشہور ہفتہ وار جریدہ میں اپنا یہ بیان شائع کیا ہے کہ علامہ اقبال کو ٹائی باندھنے کا شعور بھی نہ تھا۔ یہ بالکل مضحکہ انگیز بات ہے کہ دس سال کا لڑکا بھی ٹائی باندھنا بڑی آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے متعلق یہ کہنا کتنی نامعقول بات ہے جس نے اعلیٰ تعلیم یورپ میں حاصل کی جو اعلیٰ طبقہ کے انگریزوں کے ساتھ مل جل کر رہا۔ اور جس نے ۲۵ سال تک بیرسٹری کی پریکٹس کی۔ ان تمام باتوں سے ان کی ذہانت اور فہم و فراست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا بے بنیاد بیان شائع کرنے کا مقصد صرف شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے دل میں شاعر مشرق کا احترام نہیں ہے۔

اسی شخص نے ایک مرتبہ ایک بے بنیاد بات یہ بھی کہی تھی کہ علامہ اقبال نے اپنی آمدنی کی حد پانچسو روپے ماہوار مقرر کر رکھی تھی۔ اور جب انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی۔ تو پھر وہ کوئی مقدمہ نہ لیتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جب وہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ تو ان کے پاس ایسے مقدمے بھی آتے تھے۔ جن کی ماہانہ آمدنی پانچسو روپے سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ ایک مقدمہ کی پیروی کرنے مسٹر سی آر داس کے ساتھ پٹنہ

گئے تھے جن کی فیس دو ہزار روپے یومیہ تھی۔ مسٹر سی آر داس نے جو علامہ اقبال کے بڑے مخلص دوست تھے یہ انتظام کیا تھا کہ وہ علامہ اقبال کے ساتھ دو ہفتے رہ کر گرانقدر رقم کمائیں گے۔ مگر علامہ اقبال نے اپنا کام صرف تین روز میں ختم کر دیا اور اتنی زیادہ رقم کمانے سے انکار کر دیا جس کے وہ قانونی حیثیت سے حق دار تھے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ شاعر یا تو غیر حاضر دماغ فلسفی ہوتا ہے یا درویش ہوتا ہے گو علامہ اقبال طبعاً درویش تھے۔ مگر یہ ان کی ہمہ گیر فطری قابلیت تھی کہ وہ شاعر بھی تھے۔ اور فلسفی بھی تھے۔ مزید برآں وہ دنیا کے سارے کام بھی کرتے تھے۔ انہیں اللہ نے غیر معمولی فہم و فراست، اعلیٰ درجہ کی قوت تخیل، اصابت رائے اور قلب سلیم جیسی نعمتیں بخشی تھیں۔ انہوں نے پچیس برس تک وکالت کی۔ اور وہ اپنے زمانہ میں چوٹی کے وکیلوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

معزز حضرات! جو لوگ علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ بنظر عمیق کرتے ہیں انہیں اس میں ہر شعبہ زندگی کی رہنمائی مل سکتی ہے۔ ایک عظیم شاعر قوم کے لئے خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ خدا نے ہمیں ایسا عظیم شاعر عطا کیا ہے۔ ہم علامہ اقبال کے منفعت بخش کلام کی اس لئے قدر کرتے ہیں کہ اس میں فلسفہ زندگی کے لئے ایک زبردست تحریک پائی جاتی ہے اور اس میں انسانوں کے لئے ایک ایسا پیغام مضمر ہے کہ اگر ہم ان کی تعلیمات کو اپنی زندگی پر طاری کر لیں تو اپنی زندگی نہایت عز و شان کے ساتھ بسر کر سکتے ہیں نیز اپنی قسمت کا فیصلہ اپنی ثقافت اور روایات کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔
علامہ اقبال کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی

اور اُن کے کلام میں جا بجا قرآنی تعلیمات کا عکس نظر آتا ہے۔ قرآنی تعلیمات نے ہی ان کے خیالات کو پاکیزگی اور قوت حیات بخشی ہے ان کا معمول یہ تھا کہ علی الصباح بیدار ہو کر وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ رونے لگتے تھے حتیٰ کہ ان کے آنسوؤں سے قرآن مجید کے اوراق تر ہو جاتے تھے پھر وہ اپنے ملازم علی بخش سے کہتے تھے کہ اسے سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دے۔

بمبئی کے ایک پارسی پروفیسر واڈیا نے علامہ اقبال کے بارے میں یہ الفاظ کہے تھے "دنیا میں بڑے بڑے شاعر گزرے ہیں مگر دنیا علامہ اقبال جیسا ہمہ صفات موصوف شاعر پیدا نہ کر سکی جو بیک وقت فلسفی بھی ہو اور سیاست دان بھی گوئٹے جس کے کلام کا مقابلہ شاعر مشرق کے کلام سے عموماً کیا جاتا ہے شاید علامہ اقبال جیسا شاعر ہو مگر اس کے کلام میں بھی علامہ اقبال جیسے پاکیزہ خیالات اور آزادی فکر کا فقدان ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں فلسفہ کی روح پھونک دی ہے اور اپنے کلام سے فلسفہ میں خوبصورتی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے انسانی ثقافت میں اپنے لئے ایک ایسا بلند مقام حاصل کر لیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔" ہو سکتا ہے کہ ان کا جسم مٹی میں مل گیا ہو۔ مگر شاعر، مفکر اور بنی نوع انسان کا معلم ہونے کی حیثیت سے اُن کا روحانی اثر زمان و مکان کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے۔ ان کا کلام مسلم اور غیر مسلم کی آنے والی نسلوں کے دل میں امید، جسارت اور عقیدت کی روح پھونکتا رہے گا۔ علامہ اقبال کے کلام کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے

اگر ان کے پند و نصائح کو مشعلِ ہدایت تصور کیا جائے۔ تو اس میں وہ ایسی
زبردست قوتِ عمل موجود ہے جو انسانی کردار کو بلند ترین مقام تک
پہنچا سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کی اسی خصوصیت نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا
ہے اور لوگ رہتی دنیا تک اس سے رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

جو لوگ دل سے اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے لئے مطالعہ اقبال
کا پیغام ایک روشنی کا مینار ہے یہ شاعر اعظم قوم کے لئے ایک نعمت ہے
اور ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ ہم میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے آپ کو
بالکلیہ طور پر پیغمبر اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا اور ان کی شاعری قرآنی تعلیمات
پر مبنی تھی جس کی وجہ سے ان کے تخیلات کو ایک قوت اور ان کی زبان کو ایک
شوکت حاصل ہو گئی تھی۔ صبح سویرے کی پر نور گھڑیوں میں وہ اکثر قرآنی آیات
کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اور اس دوران ان کی آنکھیں ایسی پُرنم اور اشکبار
ہو جاتی تھیں کہ قرآن کے صفحات تر بتر ہو جاتے تھے۔ ختم تلاوت پر وہ اپنے
پرانے خادم علی بخش سے فرماتے تھے۔ کہ مذکورہ صفحات کو دھوپ میں خشک
ہونے کے لئے رکھ دیا جائے۔

محترمہ رشیدہ بیگم آفتاب اقبال صاحبہ
(علامہ اقبال کی بڑی بہو)

رشیدہ بیگم
اہلیہ آفتاب اقبال

رشیدہ بیگم صاحبہ آفتاب اقبال کی بیگم اور علامہ اقبال کی بہو ہیں خاندان
مغلیہ کے ایک عظیم آدمی میرزا دولت بیگ کی اولاد میں ہیں جو عہد شاہجہاں میں
سپہ سالاری کے عہدے پر مامور رہے تھے نسبی یگانگت کے علاوہ شاہجہاں سے
قرابت کی عزت بھی انہیں حاصل تھی مشہور تاریخی شہر شاہجہان پور اس کا
نام بانئ شہر کا ہی رکھا ہوا ہے۔

رشیدہ بیگم کے باپ دادا مشرقی پنجاب جالندھر کے رہنے والے ہیں
زمیندار پیشہ تھا۔ رشیدہ بیگم کے والد بزرگوار میرزا روشن بیگ نے برما میں
ٹھیکے رکھا تھا۔ بیگم صاحبہ وہیں پیدا ہوئیں۔ وطن واپس آنے کے بعد سلسلہ تعلیم کا
جاری ہوا۔ ابتدائی جماعتیں پاس کرنے کے بعد لاہور کالج فور ویمن میں داخلہ لیا
اور ایف ایس سی کا امتحان امتیازی شان کے ساتھ پاس کیا۔ آگے تعلیم کا سلسلہ
جاری نہ رہ سکا۔ اس لئے کہ آفتاب صاحب کے ساتھ آپ عقد نکاح میں منسلک ہو گئیں

آپ کے تین صاحبزادے ہیں، آزاد اقبال، نوید اقبال، وقار اقبال، اول الذکر
دونوں صاحبزادے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں وقار اقبال اپنے والدین کے ساتھ
رہتے ہیں اور حصول تربیت و تعلیم میں مصروف ہیں۔

بیگم صاحبہ نہایت ذہین، قابل اور امور خانہ داری میں مہارت تامہ رکھتی ہیں
اور نہایت شریفانہ صفات و اخلاق کی حامل ہیں۔ آپ کو اپنی خوشدامن یعنی

والدہ آفتاب اقبال کے زیر تربیت رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور خدمات بجالانے پھر دعائیں حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔

آپ کے والد بزرگوار اپنے دوست وزیر اعظم حبشہ ڈاکٹر سی ٹارٹن کے ہمراہ عدیس ابابا تشریف لے گئے تھے آپ کا ٹھیکہ داری کا کاروبار یہاں بڑے وسیع پیمانہ پر ترقی کر گیا تھا اور آپ کی مالی حالت نہایت مضبوط ہو گئی تھی اثرات و تعلقات کا یہ عالم تھا کہ شاہ حبشہ مسٹر ہیل سلاسی آپ کو اپنا معتمد علیہ اور مخلص دوست سمجھتا تھا۔ اسی اثناء میں اٹلی نے حبشہ پر لشکر کشی کی اور آپ کو اپنے تحفظ ناموس وجان کی خاطر اپنا سارا اثاثہ چھوڑ کر واپس ہندوستان آنا پڑا۔ ہندوستان آکر آپ اپنے وطن جالندھر کی بجائے لاہور میں مقیم ہو گئے اور یہیں انتقال فرمایا یوں جالندھر سے رشتہ منقطع ہو گیا اور لاہور بیگم صاحبہ کے لئے وطن ثانی بن گیا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم بھی مدرسۃ البنات لاہور میں ہوئی۔ آپ کو اس درسگاہ سے والہانہ محبت ہے۔ آپ کا بیان ہے کہ اس درسگاہ میں قرآن وحدیث کی تعلیم لازمی دینیات کی دی ہے میں نے اپنے دین کو یہیں سے جانا۔ مجھے اپنے مذہب سے محبت اپنے خدا سے آگہی، آقائے نامدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ سے واقفیت یہیں حاصل ہوئی۔

اقبال پر بہتان

اور اُسکی حقیقت

روزنامہ جنگ کے اس سال کے اقبال ایڈیشن میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی بھتیجی کے بیٹے خالد نذیر صاحب نے اپنی والدہ کے حوالوں سے جو دو برس کی عمر سے شادی ہونے تک علامہ اقبال کے ہاں رہی تھیں، اس شہرت کی نہایت واضح اور مدلل تردید کی ہے کہ علامہ اقبال شراب پیتے تھے۔ یہ شہرت میں نے علامہ اقبال کی زندگی میں نہیں سنی تھی تو مرنے کے بعد کسی معمولی مسلمان کے متعلق بھی ایسی باتیں زبان سے کہنا یا قلم سے لکھنا گناہ ہے۔ اتنے عظیم مسلمان پر بہتان لگانے والا خدا جانے کون ہے مجھے ۱۹۱۰ میں خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ نواب سر ذوالفقار علی خان وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ علامہ اقبال نواب صاحب کے پہلے سے مہمان تھے۔ بلکہ وہی ہم دونوں کو اپنے ساتھ پٹیالے کھینچ کر لے گئے تھے۔ میر غلام بھیک نیرنگ صاحب کے مسلم ہائی اسکول کے افتتاحی جلسے میں علامہ اقبال پٹیالے سے آئے تھے۔ اور ہم دونوں دلی سے پہنچے تھے۔ وہاں علامہ اقبال نے فرمایا کہ پٹیالے ضرور چلنا ہوگا۔ المختصر تو دس دن صبح تا شام اور شام تا صبح ہمارا اور علامہ اقبال کا ایک ہی کمرے میں مسلسل قیام رہا کھانا سب مل کر کھاتے تھے۔ شراب پینے والا شام کے کھانے سے قبل شراب کے دو چار

گھونٹ پی لے تو اس کا کیا ہاضمہ نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے علامہ اقبال اور نواب سر ذوالفقار علی خان کو شراب کا نام لیتے بھی نہیں سنا۔ علامہ اقبال کو تصوف سے مطلق واسطہ نہیں تھا پیتے ہوتے تب کھلتے پیتے بہر حال میرے پاس صرف یہی واحد گواہی ہے جسے پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ علامہ اقبال کو آنکھیں اللہ نے مدبھری عنایت فرمائی تھیں۔ جیسے مخمور معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً ان آنکھوں سے غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو گی۔ لیکن اتنا تو سوچنا چاہیئے تھا کہ عرفان۔ اور شراب ایک دل اور ایک دماغ میں کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے حافظ شیرازی کے ذکر شراب سے اختلاف کیا تو ہل چل مچ گئی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب اس ہلچل میں پیش پیش تھے مگر انہوں نے کبھی میرے کان میں بھی نہیں کہا کہ اقبال خود شراب پیتے ہیں۔ اور حافظ کی شراب معرفت پر اعتراض کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد صاحب کی بابت لکھا کہ

زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

لیکن مولانا کے شاگردوں نے پلٹ کر علامہ کو شراب خور ہونے کا طعنہ نہیں دیا۔ جس نے بہتان لگایا ہے وہ تاریخ نویسی کے زور میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھول گیا کہ اپنے وفات پائے ہوؤں کی صرف خوبیاں بیان کیا کرو۔ برائیاں اگر ہوں بھی تو ان کا ذکر پس ماندگان کو اچھا سبق نہیں سکھائے گا (ملا واحدی)

جنگ کراچی ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء

شاعرِ اسلام ۔۔۔۔ محمد اقبالؒ

اپریل ۱۹۳۸ء میں اقبال نے داعیٔ اجل کو مسکراتے ہوئے لبیک کہا یہ وہی تبسم تھا جسے اقبال نے اپنے آخری اشعار میں (مردِ مومن کے لئے) موت کا سامنا کرنے کی علامت قرار دیا تھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

پھر وہ اس طرح اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے جیسے سورج چھپ جاتا ہے لیکن اپنی وفات سے پہلے وہ عالمِ اسلام کو زندگی کی وہ حرارت اور تابندگی عطا کر گئے جو ہمیشہ اس کی راہوں کو روشن رکھے گی۔

برِ صغیر پاک و ہند کی ایمان پرور فضاؤں میں نشو و نما پانے والے اقبال کے جسدِ خاکی میں اسلام نے اپنی سچی روح پھونک دی تھی۔ اور اس لحاظ سے یہ قالب خلوصِ حق نورِ ہدایت اور پاکیزہ فطرت سے معمور تھا پھر چونکہ اس قالب میں ہند کی موروثی برہمنیت اور عرب کی حمیت دونوں کا عکس تھا۔ لہٰذا اس کے نتیجے میں ایک چھوتا شعری فلسفہ وجود میں آیا۔ یہ فلسفہ نہ تو ابو العلا المعری کا فلسفہ تھا جس کی بنیاد شک و شبہ، شکوہ و شکایت اور عدمیت پر ہے اور نہ یہ نطشے کا فلسفہ وجودیت تھا جس کی بنیاد الحاد پر ہے بلکہ یہ ایک خالص

اسلامی فلسفۂ توحید تھا جس کا روحانی منبع وحی الٰہی ہے اور جو عقل اور الہام سماوی کے ذریعے مادیت اور روحانیت کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتا ہے ۔

اقبال نے دینِ اسلام کی حقیقت کو اسی صورت میں دیکھا اور سمجھا جس صورت میں باری تعالیٰ نے اُسے اُتارا تھا۔ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس کی دعوت دی تھی۔ اور جس کی تبلیغ اور جس کا نفاذ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم) کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اقبال نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ کہ دین و دنیا کی تعمیر کا دارومدار عمل صالح پر اور سعادت دارین کا حصول ایمان حقیقی پر منحصر ہے نیز عالم اسلام کی قوت وعظمت کا انحصار عرب و عجم کے حقیقی اتحاد پر ہے لہٰذا اقبال نے اپنے مجموعۂ کلام 'اسرارِ خودی' میں ایمان حقیقی اور عبادت کے مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرد کو استقلال ذات کی دعوت دی۔ بانگ درا میں مسلم معاشرے کی بیداری اور مسلمانوں میں جذبۂ جہاد و عمل پیدا ہونے کی ضرورت پر زور دیا، اور پیامِ مشرق میں اسلامی اخوت اور باہمی تعاون کا پیغام کر دیا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب اقبال جیسا ممتاز الشان جس کی جسمانی نشوونما ارضِ کشمیر میں ہوئی تھی جس کی روح پر مکۃ المکرمہ کی ضیا پاشیوں کا اثر تھا اور جس کے اشعار کی لئے شیرازی تھی۔ دنیائے عجم میں اللہ کے دین کی زبان بن کر ابھرا۔

اقبال نے قرآنی تعلیمات کی تشریح و تفسیر عقل کو دلیل راہ بنا کر

کی اور اپنے اشعار کے ذریعے ایمان اور عقیدے کا صحیح مفہوم پیش کیا۔ اقبال نے افراد کو آزادی اور عزتِ نفس کا حقیقی کردار بخشا اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لئے تقویٰ اور محبت کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ اس مشرقی تہذیب کے علمبردار تھے جس کی بنیاد الٰہیت اور روحانیت پر ہے اور اس مغربی تہذیب سے متنفر تھے جو مادیت اور الحاد کی کمزور بنیادوں پر قائم ہوئی ہے اقبال اسلام کے تابناک ماضی کے دلدادہ تھے اور وہ مسلمانوں کو اُن کے اس ماضی کی یاد دلاتے رہے جب انسانیت کو غلامی سے نجات ملی، دلوں کو پاکیزگی حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے دُنیا میں فساد کو ختم کر کے اصلاح کا فرض انجام دیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کے اس حال سے نالاں ہیں جس میں دین و میراثِ محمدی کے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اقبال عصرِ حاضر کے ان سامراجی طاغوتوں کی سخت مذمت کرتے ہیں جو شیطانی طاقتوں کی رہنمائی میں دُنیا میں فساد پھیلا رہے ہیں اور جن کی قیادت میں سائنسی علوم اور مادہ کو بنی نوعِ انسان کو اپنا غلام بنانے کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے اقبال نے اپنے ایک شعر میں ان ہی سامراجی طاغوتوں کے بارے میں یوں کہا ہے۔

"اے اللہ تو نے آگ سے ایک شیطان کو پیدا کیا تھا مگر
مٹی سے کروڑوں شیطان پیدا کر دیے گئے"

مگر ساتھ ہی ساتھ اقبال اپنے اشعار میں اس دین پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتے ہیں جس کی پیروی کرنے والوں نے جہالت اور ضعفِ اعتقاد کی بنا پر اور بغیر سوچے سمجھے ایسے تصورات، عقائد اور رسوم کو اپنے دلوں میں جگہ

دے دی ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

اقبال کو نماز ادا کرنے والوں سے یہ شکایت ہے کہ ان کی نمازیں ان کو برائیوں سے اور فحاشی سے باز نہیں رکھتیں اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے دل حرص و ہوس سے پاک نہیں وہ ان ہزاروں مسلمانوں سے جو ہر سال بغرض حج حجاز کا سفر کرتے ہیں اور اس مذہبی فریضے کی اہمیت اور اس بڑے اجتماع کی غرض و غایت سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ ان الفاظ میں شکایت کرتے ہیں

"کوئی حج بیت اللہ سے واپس آنے والوں سے یہ نہیں پوچھتا
کہ کیا وہاں تحفے میں دینے کے لئے تم کو آبِ زمزم کی ایک شیشی
کے سوا وہاں کچھ اور نہیں ملا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر حسانؓ (حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ) شاعرِ رسول تھے تو اقبال شاعرِ رسالت تھے۔ اقبال کو محمدیت (پیغامِ محمدی) کے دفاع کا شرف حاصل ہے۔ اگر جلال الدین الرومی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صوفی بزرگ اور شاعر کی مجالس فضائلِ اسلام اور شمائلِ نبوی کے ذکر سے معطر ہیں۔ تو اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صوفی شعراء میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جو دین میں تفقہ اور حقائق کا علم رکھنے، کتاب اللہ میں فلسفیانہ انداز پر غور و فکر کرنے کلامِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عالمانہ نظر رکھنے اور مشرق و مغرب کے قدیم و جدید نظریات کے بارے میں اپنے اندر صحیح سوجھ بوجھ اور قوتِ تمیز و فیصلہ رکھنے میں اقبال کے مقام تک پہنچ سکتا ہو۔

میں نے اقبال کو ان کے افکار اور ان کے علم سے پہچانا ہے ان کی زبان

اور ان کے فن سے نہیں اور ایک عالم اور فلسفی کے بارے میں اس کے فیوض علمی
اور صحیح فکر کی روشنی میں کوئی فیصلہ دینا اور اس کا درست ہونا ممکن ہے
لیکن ایک شاعر اور فنکار کے متعلق اس کے شعر و فن کی تخلیقات کی روشنی میں
فیصلہ دینا آسان کام نہیں۔

اور پھر اقبال کی زبان اور ان کے فن اور اسلوب بیان کے محاسن سے واقفیت حاصل کیے بغیر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اقبال کے افکار و نظریات کا جو علم ہم کو حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی روشنی میں ہماری نظر میں جب اقبال ایک عظیم مصلح اور ممتاز رہنما کا مرتبہ رکھتے ہیں تو وہ مرتبہ کتنا بلند ہوتا جب ہم ان کے علم و فن کی صورت میں ان کے شعور کو شعر کے قالب میں، واقعات کو خیال کے جامے میں حقیقت کو مجاز کی شکل میں اور فکر کو تصویر میں دیکھتے اور سمجھتے۔

بہر حال کسی حد تک اقبال کے فن سے ہم ان کے دوست عبدالوہاب عزام مرحوم کے توسط سے بہرہ ور ہوئے ہیں، مگر ان کے فن کا یہ تعارف ایسا ہی ہو سکتا ہے جیسا کسی اصل تصویر کا تعارف اس کے عکس کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ ان دونوں فنکاروں (اقبال اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم) کی ملاقات "پیام مشرق" اور "ضرب کلیم" کے واسطے سے ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم نے پیام مشرق اور ضرب کلیم کا منظوم ترجمہ عربی ترجمہ کیا ہے) اور اس مبارک ملاپ نے نہ صرف یہ عربی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا بلکہ اس نے گلستان ادب عربی کو ایک نئی تازگی اور شگفتگی بخشی۔ مجھے امید ہے کہ اقبال کے پورے کلام کو قرآن کی زبان میں منتقل کیا جائے گا۔ کیونکہ بلاشبہ ان کا کلام قرآن حکیم کی الہامی

تفسیر ہے۔

وفات سے پہلے شاعر جادواں اقبال کے دل میں یہ آرزو تھی کہ ان کا کلام دُنیائے عرب میں بھی اسی طرح پڑھا جائے جس طرح دُنیا کے دوسرے حصّوں میں پڑھا جاتا ہے لہٰذا ان سے وفاداری اور عقیدت کا یہ تقاضا ہے کہ اہلِ عرب ان کی اس آرزو کو پورا کریں نیز عربی زبان وادب سے ہمارے تعلق اور اس کے لئے ہمارے جذبۂ خدمت کا یہ تقاضا ہے کہ عربی زبان کو اقبال کی لامحدود ذہانت سے فیضیاب کیا جائے۔

اقبال پر باری تعالیٰ کا یہ فضل رہا ہے کہ ان کی کئی آرزوئیں پوری ہوئیں۔ ان کی آرزو کے مطابق آج اُمّتِ اسلامیہ بیدار ہو چکی ہے اور آپس میں متحد ہو رہی ہیں اس کے لئے نئی صبح نمودار ہو رہی ہے وہ آج دنیا کے ہر حصّے میں سامراجیت، غلامی اور ظلم و استبداد کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ آج اس کی قیادت اہلِ سیف و عمل کے ہاتھوں میں ہے اور عالمی سیاست میں وہ ایک ایسے تیسرے اور مضبوط بلاک کی حیثیت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے جہاں امن و استقرار کا دور دورہ ہو۔

اقبال پر اللہ کی رحمت ہو اور اللہ ان کو ان کے عمل اور خلوص کا ثواب عطا فرمائے اور ہم میں سے ہر کسی کو ان کی دعوت کو آگے بڑھانے اور ان کے افکار کو عام کرنے کی توفیق دے۔

ترجمہ مقالہ احمد حسن الزیات مدیر مجلہ الازہر

جنگ ۱۳ر جون ۶۸ء

علامہ سے متعلق چند حقائق

مولف روزگار فقیر سید نجم الدین راوی ہیں کہ

۱۔ **خدا کے وجود کی دلیل** ایک بار آپ سے سوال کیا گیا، کہ آپ کے نزدیک خدا کی حقیقت قابل تسلیم کیوں ہوئی ہے؟ تو جواب دیا کہ میرے پیغمبر نے، جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے جب فرمایا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقیناً ہے۔

۲۔ **غالب اور رومی سے ملاقات** ایک بار استغراق کی حالت میں اپنے خادم کو کہا کہ میرے پاس مرزا غالب بیٹھے تھے ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ جلدی جاؤ انہیں واپس لاؤ۔ اور انتقال سے چند روز قبل انہوں نے مولانا رومی کے متعلق خادم سے کہا وہ ابھی میرے پاس تھے باہر گئے ہیں۔ انہیں واپس بلا لاؤ۔

۳۔ ایک روز حکیم احمد شجاع علامہ کے مقام پر پہنچے تو ان کو بہت مغموم اور بے چین پایا۔ اور گھبرا کر دریافت کیا خیریت تو ہے۔ علامہ نے غم انگیز لہجے میں فرمایا احمد شجاع یہ سوچ کر میں اکثر پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہؐ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے علامہ کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۷ء ہے اس حساب سے ۱۹۳۸ء میں انتقال کے وقت ان کی عمر رسول اکرمؐ کے سن مبارک سے دو سال کم تھی یعنی ۶۱ سال تھی۔

۴۔ میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ فرمایا ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ امتحان ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے کے لئے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے چائے پی کے چلے نہ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشہ میں لے گئے اور کہنے لگے اقبال مجھے بتاؤ۔ کہ کیا تمہارے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان ہی آتی تھی لہٰذا انہوں نے قرآن کریم کو عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اسی طرح اُتری تھی۔ میں نے کہا یہ عبارت ہی اُتری تھی۔

ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا تم جیسا پڑھا لکھا آدمی ایسی بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اُتری ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر لوکس یقین کیجئے میرا تجربہ ہے کہ مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہیں پوری اُترتی ہو گی۔

۵۔ والد مرحوم سے ڈاکٹر صاحب کو بے حد محبت تھی۔ والد نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق ایک اور واقعہ سنایا کہنے لگے میں ایک دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اکیلے بیٹھے زار وقطار رو رہے ہیں۔ میں نے کہا خیر باشد گھر میں تو سب لوگ باخیر و عافیت ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں سب باخیریت ہیں۔ میں نے پوچھا تو آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں۔ ڈاکٹر

صاحب نے جواب دینے کی بجائے میری طرف ایک خط بڑھایا جو لندن سے اُسی دن اُن کے نام آیا تھا۔ یہ خط پروفیسر نکلسن کی طرف سے تھا جس نے ڈاکٹر صاحب سے اُن کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی میں نے تعجب کیا اور کہا اس میں کونسی ایسی بات ہے کہ تم نے رونا شروع کیا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ دوسرے ملکوں کے اہل علم تم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یورپ کے لوگوں کو بھی اُس سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت برابر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے کہ جس قوم کے دل میں احساس خودی پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی۔ وہ تو پوری طرح اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتی اور نہ اُس کا مطلب سمجھا سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ میرے پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ کتاب میں نے اُن کے لئے نہیں لکھی ہے۔

ایک مرتبہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے مجھے دیکھ کر کتاب بند کر دی اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں پلنگ سے کچھ ہٹ کر ایک قالین پڑا تھا جس کی رنگت اور گل بوٹے آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ نیا قالین خریدا ہے کہنے لگے۔ اس قالین کا قصہ بھی عجیب ہے۔ آج صبح ایک شخص جس کا نام تک میں نہیں جانتا یہ قالین لے کر آیا اور کہنے لگا۔ میں دو تین روز ہوئے فریضۂ حج ادا کر کے لاہور پہنچا ہوں۔ ایران کی سیر کا مجھے مدت سے شوق تھا۔

اس لئے واپسی پر اسی راستہ اختیار کر لیا۔ تہران میں حسن صاحب کے ہاں میرا قیام تھا انہیں جب معلوم ہوا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں اور حج کر کے اپنے وطن واپس جا رہا ہوں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ تم نے کبھی حضرت اقبال کو دیکھا ہے میں نے کہا جی ہاں کئی مرتبہ، یہ سنتے ہی وہ میری طرف بڑھے میری آنکھوں کو بوسہ دیا۔ اور دیر تک بڑے اشتیاق سے آپ کے حالات پوچھتے رہے جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو گھر میں سے یہ قالین نکال لائے۔ اور کہنے لگے۔ کہ لاہور پہنچ کر اسے اُن کی خدمت میں پیش کر دینا۔ یہ قالین ایک ایرانی عقیدت مند کا ایک تحفہ ہے۔ جو میں اُس کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

۷۔ ڈاکٹر صاحب کو لندن کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کا موقعہ ملا جہاں صرف اسلامیات کے متعلق تقریریں ہو رہی تھیں۔ اس اجتماع میں مختلف نسلوں کے تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ لوگوں کے اصرار پر حکیم الاُمت نے بھی ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اسلام کے اصولوں پر روشنی ڈالی جب وہ تقریر ختم کر چکے تو ایک انگریز اُن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا ہے اگر یہی اسلام ہے۔ تو ہم سب مسلمان ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی کو بر سرِ عام یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

۸۔ "شاعر کی آنکھیں" ایک دفعہ میں نے زمانہ کی قدر ناشناسی کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ لوگ اپنے ملک کے

بڑے بڑے شاعروں قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں اُن کی قدر نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب اس سوال سے متأثر ہوتے اور کسی قدر تامل کے بعد فرمایا تم غور کرو تو معلوم ہو گا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں — اور صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہیں۔

۹۔ مظلوم بعض ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جو نہ عربی زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد رکھتے ہیں۔ نہ عرب قدیم کے علمی سرمایہ پر انکی نگاہ ہے نہ قرآن کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اپنی اس علمی تہی مایگی کے باوجود قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی کوشش فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کو اس قسم کی باتوں سے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی متانت و سنجیدگی اور عالی ظرفی کے باوجود اس غم کو چھپا نہ سکے۔ ایک بار فرما ہی دیا۔ قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا مظلوم صحیفہ ہے کہ جب دنیا میں کسی کو کوئی کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت نازک اور محتاط ذمہ داری ہے

۱۰۔ چالیس سال:۔ ایک بار ایک لیڈر خاتون کی حوصلہ افزائی کرتے ہوتے ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس مذہب کی خوبیاں چالیس سال کی عمر کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ تمہارا کام تو زمین کو ہموار کرنا ہے اور اس میں

پودا لگاتا ہے۔ یہ پودا ایک دن خود بخود تناور درخت بن جائے گا اور پھل لائے گا۔

۱۱۔ سر سید احمد کی وفات پر ڈاکٹر صاحب کے استاد میر حسن نے تاریخ نکالی جو یہ ہے "غفر لہٗ" ۱۳۱۵ھ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس آیت سے تاریخ نکالی: انی متوفیک و رافعک الیّ و مطہرک ۱۳۱۵ھ

۱۲۔ خطبات مدراس:۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک بار خاص انداز میں فرمایا کہ اگر میری یہ کتاب "تشکیل جدید" (خطبات مدراس) خلیفہ مامون رشید کے دور میں شائع ہوتی تو پورے عالم اسلام میں ایک تہلکہ مچ جاتا۔

۱۳۔ علامہ اقبال ضرورت کے مطابق کپڑے سلوایا کرتے تھے۔ فالتو جوڑے رکھتے تھے۔ اور نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے کا ان کو شوق نہ تھا۔ جب کپڑے ختم ہو جاتے تو علی بخش اپنی پسند کا کپڑا خرید لاتا اور درزی کو پیسہ کر دیتا دھوتی بنیان زیادہ پہنتے تھے۔

۱۴۔ آمدنی: ان کی ذاتی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کبھی نہ بڑھی۔ بیرسٹری کے زمانے میں عام طور پر ان کے مقدمات قبول کرنے کی آخری تاریخ ہر مہینہ کی دس تاریخ تھی۔ منشی اور مکان کا کرایہ سات سو روپے کے لگ بھگ تھا جب اتنی رقم کے مقدمات آجاتے، تو مزید مقدمات لینے سے انکار کر دیتے جب اصرار کیا جاتا تو کہتے کہ آنے والے مہینے کی شروع کی تاریخوں میں آنا۔

۱۵۔ **لطائفِ اقبال:-** ایک دفعہ ایک طوائف اور چودھری دین محمد کے درمیان مقدمہ بازی ہوئی۔ چودھری کے وکیل شہاب الدین (نہایت کالے تھے) اور طوائف کے وکیل اقبال تھے۔ جج نے سوال کیا کہ طوائف کا دفاع کون کرے گا۔ شہاب الدین نے مذاقاً کہا کہ سر نائٹ knight یعنی نائٹ (سر دار) عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کا آج سر اقبال دفاع کریں گے۔ جواب میں اقبال نے کہا کہ جناب والا میرے اور اُن کے درمیان صرف K کا فرق ہے۔ میں K سے نائٹ ہوں اور وہ بغیر K کے یعنی Night (رات)۔

۱۶۔ فقیر سید وحید الدین کو کتوں کے پالنے کا شوق تھا۔ ایک بار اقبال سے ملنے گئے۔ اور پالتو کتے موٹر میں چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد اقبال کی چھوٹی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں۔ اقبال نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا نہیں بیٹی یہ تو آدمی ہیں۔

۱۷۔ اکبر الہ آبادی نے جب لنگڑا آم اقبال کے پاس بھیجا تو اقبال نے رسید کے طور پر ان کو لکھا۔

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا اور لاہور تک پہنچا

۱۸۔ اقبال کو عمر بھر کسی ایسے محرم راز کی تمنا رہی جو اُس کے پیغام کی حقیقت کو پہچانے اور اس کے ذریعے قوم کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑائے۔ لیکن وہ اس حسرت کو دل میں ہی لے کر چلا گیا۔ اور کتنی بڑی حقیقت تھی جب ان سادہ الفاظ

میں بیان کر گیا کہ:

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

پہلے والا کہہ گیا اور بعد کے زمانے نے اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق کر دی۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد (اپریل ۱۹۳۸ء سے آج تک) ان کی زندگی اور تصنیفات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اقبال کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے بنیادی غلطی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، حالانکہ وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میں شاعر نہیں نہ شاعری میرا مقصود ہے مثنوی رموز و اسرار کی تمہید میں (جو علامہ اقبال کے پیغام کا سب سے پہلا مجموعہ ہے) وہ علانیہ کہتے ہیں۔ کہ

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی بت گری مقصود نیست

اور عمر بھر انہیں اس بات کا گلہ رہا کہ:

مرا یاران غزلخوانے شمردند

لیکن کلام اقبال کے شیدائی ہیں کہ انہیں شاعر ہی کی حیثیت میں پیش کرنے پر مصر ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال بظاہر ایک شاعر ہے اور بہت بلند شاعر لیکن اس کی شاعری محض اس کے پیغام کے اظہار کا ذریعہ ہے، نہ کہ مقصود بالذات۔ پھر یہ کیا قباحت ہے کہ اگر ایک مفکر اپنے افکار و تصورات کو نثر میں پیش کرے تو اسے مفکر سمجھا جائے لیکن اگر وہ ان کا اظہار نظم میں کر دے تو وہ مفکر نہ رہے، فقط شاعر رہ جائے۔

کچھ دوسری قسم کے لوگ ہیں جو اقبال کو ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ انکے نزدیک اقبال کے افکار و نظریات کے ماخذ حکمائے مغرب مثلاً نیٹشے، برگسان وغیرہ وغیرہ کے خیالات و تصورات ہیں اور اگر وہ بعض صورتوں میں ماخذ نہیں تو کم از کم اقبال کے خیالات ان فلاسفر سے متاثر ضرور ہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت ہمارے حیطہ بحث سے خارج ہے کہ اقبال کا فلسفہ کس طرح ایک مستقل اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس پیچیدگی کا آسان ترین حل یہ ہے کہ ہم خود اقبال سے پوچھیں کہ اس کے افکار و تخیلات کا سرچشمہ کیا ہے علامہ اقبال رح اپنی پہلی مستقل تصنیف اسرار و رموز کے آخر میں لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں خدائے حی و قیوم کے پیغام آخریں یعنی قرآن کریم کے اسرار و معارف بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد یہ التجا کرتے ہیں کہ:

گر دلم آئینہ بے جوہر است   ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اور پھر اپنے لئے ایک ایسی بد دعا جس کے تصور ہی سے ہر مسلمان کی روح کانپ اٹھے یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے اپنی محرومی۔

روز محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسہ پا کن مرا
گر در اسرار رفتہ آں سفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا   آب نیسانم گہر گرداں ام

یہ ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ اس کے بعد آخری وقت تک وہ اپنے ایک

ایک مقام میں اس حقیقت کا اعلان کرتے رہے کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے قرآن سے سمجھا ہے۔ اور جو کچھ سمجھ رہا ہوں قرآن سے سمجھ رہا ہوں۔ لہذا یہ کہنا کہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات اور اپنا فلسفۂ حیات مغرب کے حکماء سے مستعار لیا تھا اس پر اتنا بڑا ظلم ہے جس کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہماری تعلیم یکسر مغرب کے افکار و تخیلات کی گداگری ہے اس لئے ہم ہمیشہ اس جذبۂ مرعوبیت میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر سچا موتی کسی نہ کسی مغربی سمندر کی صدف کا پروردہ ہے حالانکہ اگر ہمیں اپنے ہاں کا کچھ بھی علم ہوتا اور اس علم سے ہماری نگاہوں میں صحیح بصیرت پیدا ہو جاتی۔ تو ہم دیکھتے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی حقیقت کی کوئی کرن ہے وہ قرآن کریم ہی کے چشمۂ نور کی رہینِ کرم ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم اس کا پیغام ہے جو حقیقت کلی اور صداقت مطلق ہے اور اس پیغام میں ذہن انسانی کی کسی قسم کی آمیزش کو کوئی دخل نہیں۔ قرآن سراپا روشنی ہے اور روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شے کی اصل حقیقت اور اس کے صحیح صحیح مقام کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس لئے جس مفکر کے افکار کا ماخذ قرآن ہو اسے کہیں اور سے دریوزہ گری کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ حتم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ:

جہاں را جز بچشم خود ندیدم

لہذا پیام اقبال کو نہیں سمجھا جا سکتا تاوقتیکہ قرآن کو نہ سمجھا جائے۔

مقدمہ از خطبات اقبال

IQBAL ... 15371 LAHORE